رومانوی مکتب

(پہلا حصہ)

ہنرخ ہائنے
ترجمہ: خالد فتح محمد

مادام دی سٹائل کی تصنیف دی ل ایلمگنے (De l' Allemagne) ،جرمنی کی زندگی کے بارے میں واحد تفصیلی بیان ہے جس تک فرانسیوں کی رسائی ہے۔کتاب کے آنے کے بعد اب تک کافی وقت گزر چکا ہے اور جرمنی میں ادب کا نیا مکتب وجود میں آ چکا ہے۔کیا یہ عبوری ادب ہے؟ کیا یہ اپنے نکتۂ عروج تک پہنچ چکا ہے؟ کیا اس کا ابھی سے زوال شروع ہو گیا ہے؟اس سلسلے میں آرا مختلف ہیں ۔ اکثریت کو یقین ہے کہ گوئٹے کی موت کے ساتھ ہی جرمنی میں ایک نئے ادبی دور کا آغاز ہوا ہے، کہ اس کے ساتھ ہی پرانی جرمنی قبر میں اُتر گئی ہے، کہ ادب کا اشرافیہ دور اختتام پذیر ہوا اور جمہوری دور ابھی شروع ہو رہا ہے، یا جیسے ایک فرانسیسی رسالے نے کہا،''فرد کی تعقلی اقلیم اختتام پزیر ہوئی۔جم غفیر کی حکومت کا آغاز ہوا''۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں جرمن تعقل کے مستقبل کے ارتقا پر قطعی رائے دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔میں نے کئی برس پہلے گوئٹے کے''فن کے دور'' کے اختتام کی پیشین گوئی کرنے کی جسارت کی تھی، میں نے سب سے پہلے اس دور کو''یہ'' نام دیا۔ میں بحفاظت اس پیشین گوئی کی جسارت کر سکتا تھا کیونکہ میں اُن آمادہ بغاوت کے طریقوں اور ذرائع سے واقف تھا جو گوئٹے کی سلطنتِ فن کو ختم کرنا چاہتے تھے،اور یہ بھی دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ میں نے گوئٹے کے خلاف باغیانہ شورو شر میں حصہ لیا۔

جب کہ میں اس کتاب کو مادام دی سٹائل کی دی ل ایلمگنے کا تسلسل ہونے کا اعلان کرتا ہوں اور معلومات سے بھری ہونے کے سبب اس کی بے انتہا تعریف کرتا ہوں،اس کے باوجود اس کتاب میں بیان کیے نظریات کو تسلیم کرنے کے لیے میں احتیاط برتنے کی سفارش کرتا ہوں، جسے میں

ایک مخصوص ٹولے کی کتاب کہنے پر مجبور ہوں۔ مادام دی سٹائل، درخشاں یادداشت والی، یہاں کتاب کی شکل میں ایک آرائش گاہ کے درواکرتی ہے جس میں وہ جرمن مصنفین کو خوش آمدید کہتی ہے اور انہیں فرانس کی مہذب دینا سے متعارف ہونے کا موقعہ بہم پہنچاتی ہے۔لیکن وہاں مختلف آوازوں میں بے ربط مباحث کے شور میں سب سے اوپر سنائی دینے والی نرم آواز محترم اے۔ڈبلیو شلیگل کی ہے۔ جہاں بڑے دل والی عورت اپنے آپ میں ہے ___ جہاں دوسرے اس پر اثر انداز نہیں اور اپنی شفاع افگن روح کے خیالات کا اظہار کرتی ہے، اپنی تعقلی آتشبازی اور روشن خیالیوں کا ___ وہاں تک کتاب اچھی بلکہ بہترین ہے۔لیکن جونہی وہ اجنبی اثرات کے سامنے ہتھیار ڈالتی ہے، جونہی وہ ایک مکتب، جس کی روح اس کے لیے مکمل طور پر غیر مانوس اور نا قابل فہم ہے، کی تعریف شروع کرتی ہے، جیسے ہی یہ مکتب رومن کیتھولک رجحانات کو آگے بڑھاتا ہے جو اُس کی اپنی پروٹسٹنٹ وضاحت کے مکمل تضاد میں ہے، اسی وقت بے اثر اور غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔اس بلا ارادہ بے جا طرف داری میں وہ تعقلی سرگرمی کی تعریف کر کے، جرمنی عینیت کے ذریعے، فرانسیسیوں میں موجود حقیقت پسندی اور سلطنت کی ماوی تابنا کی کو بُرا کہہ کر ایک واضح مقصد کا اضافہ کرتی ہے۔اس لحاظ سے اس کی کتاب دی ل ایمگنے ٹیسی ٹس کی جرمینیا Germania of Tacitus سے مشابہت رکھتی ہے جس میں جرمنوں کی قصیدہ گوئی کر کے ہم وطنوں پر طنز کی گئی ہے۔اس مکتب کا حوالہ دیتے ہوئے جس کی مادام دی سٹلائل نے تعریف کی اور جس کے رجحانات کو اس نے آگے بڑھایا، اس سے میری مراد رومانوی مکتب ہے۔یہ فرانس میں موجود اس نام کے مکتب سے کافی مختلف تھا جو اسی نام سے جرمنی میں موجود تھا اور اس کے رجحانات فرانسیسی رومانویت پسندوں سے مختلف تھے۔اس کی آنے والے صفحات میں تشریح کی جائے گی۔

لیکن جرمنی میں رومانوی سکول کیا تھا؟

یہ قرون وسطیٰ کی شاعری کے احیا کے علاوہ کچھ نہیں تھا، جیسا کہ اس نے اُس دور کی نظموں، مصوری، مجسموں، فن اور زندگی میں خود کو آشکار کیا۔['شاعری' سے ہائنے کی مراد تمام تخیلاتی ادب ہے] اگرچہ یہ شاعری، عیسایت میں سے پروان چڑھائی گئی، یہ محبت کا پھول تھا جو حضرت عیسیٰ کے خون سے کھلا_ مجھے نہیں معلوم کہ افسردگی کا پھول جسے جرمنی میں تم محبت کا پھول کہتے ہو، فرانس میں بھی اسی نام سے جانا جاتا ہے، اور اگر مقبول عام روایت نے اُسی عارفانہ ماخذ سے منسوب کیا ہے۔ یہ وہ مختلف العلون، افردگی کا پھول ہے جس کے بیرونی حصے کو غور سے دیکھنے سے اُن اوزار کی نقلی پیشکش نظر آتی ہے جنہیں حضرت عیسیٰ کو سولی چڑھاتے وقت استعمال کیا گیا تھا _ ہتھوڑا، زنبور اور کیل۔ یہ پھول کسی طرح

بھی نظر یہ گراں نہیں گزرتا بلکہ جادوئی خصوصیات لیے ہے: یہ منظر ہماری روحوں کو ایک دھشت ـ مزے سے بھر دیتا ہے، ان ہیجانی، میٹھے جذبوں کی طرح جو دکھ سے نمو پاتے ہیں۔ اس سلسلے میں محبت کا پھول عیسایت کی موزوں ترین علامت ہوگی، جس کا حیرانی و تعریف کو تحریک دینے والا افسوں لطف انگیز درد پر مشتمل ہے۔

اگرچہ فرانس میں عیسایت اور رومن کیتھولزم ہم معنی ہیں پھر بھی میں اس امر پر زور دینا چاہوں گا کہ میں یہاں آخرالذکر کا حوالہ دے رہا ہوں۔ میں اُس مذہب کا حوالہ دے رہا ہوں جس کے انتہائی ابتدائی عقائد طبعی وجود کو رد کرتے تھے، نہ صرف طبعی جسم پر روح کی بالادستی کو قبول کرتے تھے بلکہ آخرلذکر کو شرمسار کرتے تا کہ اول الذکر کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش کی جائے۔ میں اُس مذہب کا حوالہ دیتا ہوں جس کے غیر قدرتی مشن کی وجہ سے دنیا میں برائی اور منافقت آئی، کیونکہ طبعی جسم پر نفرت کی وجہ سے حیات کی نہایت معصوم طمانیت گناہ کے زمرے میں آتی تھی، اور مکمل طور پر روحانیت ناممکن تھی، منافقت کا پھیلنا ناگزیر تھا۔ میں اس مذہب کا حوالہ دیتا ہوں جو تمام دنیاوی لذتوں کو ترک کرنے کی تعلیم دے کر، ناکارہ انکساری اور ملکوتی شکیبائی سکھا کر، استبدادیت کا سب سے مجرب سہارا بنا۔ آدمی اب اُس مذہب کی فطرت کو پہچانتے ہیں، اس کے بعد وہ جنت کے وعدوں سے بہلائے نہیں جا سکیں گے، وہ جانتے ہیں کہ مادی دنیا کی اپنی اچھائیاں ہیں، یہ شیطان کے تمام تر قبضے میں نہیں، اور اب دنیا کی لذتوں کی تائید کرتے ہیں، دیوتاؤں کا یہ خوبصورت گلشن، ہماری غیر منکف وراثت۔ صرف اس لیے کہ ہم اب اس مطلق روحانیت کے مکمل نتائج کو سمجھتے ہیں، ہمیں یہ یقین کرنے میں اختیار ہے کہ عیسائی۔ کیتھولک کائناتی نظریات نکتۂ اختتام پر ہیں: کیونکہ ہر یُگ ایک سفنکس ہے جو مشکل کے ہوتے ہی پاتال میں کود جاتا ہے۔

ہم کسی بھی طرح اُن عیسایت کیتھولک نظریات سے انکار نہیں کرتے جو یورپ پر اثر انداز ہوئے۔

اُن کی اُس خوفناک مادہ پرستی کے خلاف ایک مفید ردعمل کی ضرورت تھی جو رومن سلطنت میں ارتقا پذیر ہوئی تھی، اور انسانیت کے تعقلی جاہ وجلال کے لیے خطرہ تھی۔ جیسے پچھلی صدی کی جنس پرستانہ یادداشتیں انقلاب فرانس کی تائیدی دستاویزات بنیں؛ جیسے ظلم کا دور ولدیت سلطنت کے بعد فرانسیی امرا کے اعترافات کو جاننے کے بعد درست دوا نظر آتا ہے، جب ہم پیٹر ونیس یا اپولیس پڑھیں تو زاہدانہ روحانیت کی افادیت عیاں ہوجاتی ہے۔ اس رومن دنیا میں مادی جسم اتنا گستاخ ہو چکا تھا کہ اسے رام کرنے کے لیے عیسائی ضبط کی ضرورت تھی۔ جس طرح ٹریما کیوں کی دعوت کے بعد بھوکا رکھ کے علاج

کیا جاتا تھا، اسی طرح [بے لگام جسم پرستی کے بعد] عیسایت کی بھی ضرورت تھی۔

یا شاید عمر رسیدہ، لذت پرست اناج کچرے سے، اکتائے ہوئے مادی جسم کی تجدید لطف کی گنجائش تلاش کرتی ہیں؟ کیا بوڑھے ہوتے روم نے بذاتِ خود اذیت میں بے انتہا لطف حاصل کرنے کے لیے راہبانہ تازیانہ زنی کے آگے ہتھیار ڈال دیے، درد میں شہوانی مسرت؟

بدقسمتی سے پُر زیادتی! اس نے رومن ہیئت سیاسی کو آخری توانائی سے محروم کر دیا۔ روم سلطنت کے دو حصوں میں تقسیم ہونے سے تباہ نہیں ہوا تھا۔ باسفورس اور ٹائبر پر، روم یہودہ کی اُسی روحانیت سے تباہ ہوا، اور دونوں میں رومن تاریخ رینگتی موت کا ریکارڈ بن گئی، موت کی تکلیف جو صدیوں تک برقرار رہی۔ مقتول یہودہ نے شاید، رومنوں کو اپنی روحانیت وصیت کے طور پر دے کر، فاتح دشمن سے بدلہ لینے کی کوشش کی، جیسے دم توڑنے قنطور نے، کمال عیارانہ چاپلوسی سے جیوپڑ کے بیٹے کو اس کے خون سے زہر آلود خلعت پہنادی؟ حقیتاً، روم، قوموں میں پرکیولیس، یہودہ کے زہر سے ایسے تباہ ہوا کہ اس کے زوال پذیر جسم سے پتوار اور زرہ بکتر گر گئے، اور اس کے متکبر جنگی لہجے ٹسوے بہاتے پادریوں کی عبادات اور خواجہ سراؤں کے گٹکری گانے میں انحطاط پذیر ہو گئے۔

جو بوڑھوں کو کمزور کرے، نوجوانوں کو طاقت دیتا ہے۔ روحانیت کا بہت مضبوط شمالی نسلوں پر مفید اثر ہوا۔ خونی وحشی عیسایت کے ذریعے روحانی بن گئے، یورپی تہذیب کا آغاز ہوا۔ یہ عیسایت کا قابل تعریف اور متبرک مرحلہ ہے۔ اس سلسلے میں کیتھولک چرچ نے ہماری بے پناہ عزت اور تعریف حاصل کی۔ عالیشان اور ہمدرد اداروں کی معرفت اس نے شمالی جتھوں کی درندگی پر قابو پایا اور اُن کی ناشائستہ مادیت کو مطیع کیا۔

قرونِ وسطیٰ کے فن پارے روح کے مادے پر غلبے کی گواہی دیتے ہیں؟ اور اکثر اُن کا یہی مدعا ہوتا ہے۔ اس دور کی رزمیہ نظموں کی اسی حوالے سے درجہ بندی کی جا سکتی ہے کہ وہ کس حد تک روح کے مادے پر غلبے کو دکھاتی ہیں۔ لیرک اور ڈرامے کے بارے یہاں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وجہ ہے کہ موخرالذکر کا وجود نہیں اور اول الذکر تمام ادوار میں ایک سے ہی ہیں، بالکل بلبل کے نغمے کی طرح جو ہر موسم بہار میں ایک ہی ہوتا ہے۔

اگرچہ قرونِ وسطیٰ کی رزمیہ شاعری متبرک اور سیکولر میں تقسیم تھی مگر دونوں اقسام مزاجاً عیسائی تھیں۔ کیونکہ اگر متبرک شاعری کلی طور پر یہودیوں اور اُن کی تاریخ کے متعلق تھی، صرف جسے متبرک سمجھا جاتا تھا، اگر اس کے موضوعات نئے اور پرانے عہدنامے کے سور ماؤں اور اُن کے قصے

تھے۔ مختصراً چرچ۔ پھر بھی اس دور کے تمام مسیحی نظریات اور مقاصد کا عکس سیکولر شاعری میں تھا۔ ''برم'' Barlaam اور ''جوسافٹ'' Josaphat غالباً قرونِ وسطیٰ کی جرمن شاعری کی معراج ہے، نظم جس میں ترکِ خواہشات، ضبطِ نفس، لاتعلقی، تمام دنیاوی خوشیوں کی تحقیر کے عقاید کو استقامت سے بیان کرتی ہے۔ اس کے بعد معیار کی ترتیب میں میں ''لوبجی سانگ اوف ڈکین ہیلیجن اینو'' Lobgesang auf den Heiligen Anno کو رکھوں گا، لیکن آخر الذکر نظم کے پہلے ہی سیکولر موضوعات کی طرف واضح رجحانات ہیں۔ یہ عمومی طور پر اولذاکر سے قدرے مختلف ہے جیسے ایک بازنطینی درویش کی شکل اس کے پرانے جرمن اظہار سے مختلف ہے۔ ان بازنطینی تصویروں کی طرح ہمیں ''برلدم اور جوسافٹ'' میں بے انتہا درجے کی سادگی نظر آتی ہے، وہاں کوئی تناظر نہیں، اور طویل، دُبلی، مجسموں سی ہیئتیں، انتہائی سنجیدہ اور آئیڈیل شکل، جیسے زرد سونے کے پس منظر میں انتہائی واضح اور نمایاں نظر آتی ہیں۔

لوبجی سانگ اوف ڈکین ہیلیجن اینو'' میں پرانی جرمنی تصویروں کی طرح ضمنی تفصیل اصل موضوع سے زیادہ واضح نظر آتی ہے، نمایاں خاکے کو اہمیت دیے بغیر، ہر تفصیل باریکی سے بیان کی گئی ہے۔ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کی تعریف کی جائے، دیوہیکل خیال یا تکمیل کا کوتاہ پن۔ اوٹ فریڈ کی ''ایون جیلین جے ڈسٹ''، جسے متبرک شاعری کا شاہکار سمجھا جاتا ہے، ان دونوں نظموں سے کم تر ہے۔

جیسے اوپر بیان کیا گیا ہے، سیکولر شاعری میں ہمیں اسطور کا سلسلہ جسے Nibeiungenbed کہا جاتا ہے، اور سومائوں کی کتاب ملتی ہے۔ ان نظموں میں عیسایت سے پہلے کا اسلوبِ فکر اور احساسات غالب ہیں، وحشیانہ طاقت ابھی شریفانہ سورمائی میں تبدیل نہیں ہوئی ہے، شمال کے سخت جان جنگجو پتھر کے مجسموں کی طرح کھڑے ہیں، ابھی تک عیسایت کی نرم روشنی اور اخلاقی ماحول اُن کے لوہے کے بکتر میں داخل نہیں ہوا۔ لیکن جرمنی کے پرانے جنگلوں پر صبح طلوع ہو رہی ہے، پرانے اور متبرک شاہ بلوط گرائے جا رہے ہیں، اور کھلے میدان میں عیسایت اور لامذہبیت برسرِ پیکار ہیں۔ اس کی chariemagne کی کہانیوں کے سلسلے میں تصویر کھینچی گئی ہے، یہاں تک کہ صلیبی جنگوں کا اُن کے مذہبی رجحانات کے ساتھ بھی بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اب عیسایت اور روحانیت زدہ ہوتی ہوئی وحشی طاقت سے قرونِ وسطیٰ کے مخصوص خدوخال نمو پاتے ہیں، سورمائی (شریفانہ بہادری)، Chivalry جو آخرکار مذہبی سورمائی کی عظمت بن جاتی ہے۔ ابتدائی دور کی سورمائی کی آرتھر بادشاہ کی اسطور میں جو پرفسوں جواں مردی، تکمیل یافتہ شائستگی اور جرأت مندانہ دلیری سے بھری ہیں، کی موزوں طریقے سے

عکاسی کی گئی ہے۔خوش کن مگر عجیب وغریب،نفیس اور مبالغہ آمیز،مرصع ومسجع کہانیوں کی بھول بھلیوں کے درمیان میں،خلیق Gawain ہمارا استقبال کرتا ہے۔جھیل کا قابل احترام سردار لانسے لوٹ،بہادر جواں مرد اور ایمان دار لیکن کسی حد تک اکھڑ Wigalois بھی ہمیں ملتے ہیں۔اساطیر کے سلسلے کے اس کنارے کے ساتھ ہم متبرک Grail کی اسطور کو ہم نفس اور جڑی ہوئی پاتے ہیں،جس میں مذہبی سرداری کی عظمت بیان کی گئی ہے اور جس میں قرونِ وسطیٰ کی تین مشہور نظمیں ملتی ہیں یہ Lohangrin اور Titurel Parcival ہیں۔ان نظموں میں ہم اپنے آپ کو رومانی شاعری کی دیوی کے روبرو کھڑے پاتے ہیں۔ہم اس کی بڑی اور اُداس آنکھوں کی گہرائی میں دیکھتے ہیں اور اس سے قبل کہ ہمیں پتہ چلے وہ ہمیں اپنی الٰہیاتی علمیت scholasticism کے انتہاتی جالے کے فریب میں پھنسالیتی ہے،اور ہم قرونِ وسطیٰ کے ناقابل یقین تصوف کی ہیبت ناک گہرائیوں میں گم ہو چکے ہوتے ہیں۔لیکن اگر آگے بڑھیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس دور میں ایسی نظمیں ملیں گی جو غیر مشروط طور پر عیسائی روحانیت کے آگے گھٹنے نہیں ٹیک دیتیں_ حتیٰ کہ ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں اس پر حملہ کیا گیا، جن میں شاعر عیسایت کی بے وجود اخلاقی بیڑیوں کو توڑ کر،خوش فہمی سے درخشاں حسیت کی راحت بخش قلمرو میں غوطہ لگاتا ہے۔نا ہی یہ کوئی ادنیٰ شاعر ہے جو ہمیں Tristan اور Isolde میں چھوڑ جاتا ہے جو اس طبقے کا شاہکار ہے۔فی الواقع ،مجھے اعتراف کرنے میں کوئی اعتراض نہیں کہ اس عمدہ نظم کا مصنف گوٹفر یڈ وون ٹراسیرگ،شاید اس دور کا ممتاز ترین شاعر ہے۔وہ وولف رم وون ایشلیاک کی عظمت کو بھی پیچھے چھوڑ جاتا ہے،حال آنکہ اُس کی نظم Parcival اور Titurel کے بچے کھچے حصوں کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔اس وقت جناب گوٹفر یڈ کی شاید کھل کر تعریف کرنے اجازت ہے لیکن اس کے اپنے زمانے میں اس کی کتاب اور ایسی نظمیں، یہاں تک کہ Lancelot بھی ان میں شامل ہے، بے دین اور خطرناک تصور کی جاتی تھیں۔فرانیسا داپونیتا اور اس کے خوبرو دوست کو ایسی کتاب اکھٹے پڑھنے کا خمیازہ بھگتنا پڑا،_ یہ سچ ہے کہ زیادہ خطرناک بات اُن کا اچانک مطالعے کو ترک کرنا تھی۔

قرونِ وسطیٰ کی تمام شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے،جس کے باعث وہ رومیوں اور یونانیوں کی شاعری سے مختلف تھی۔اس فرق کے حوالے سے اول الذکر کو روحانوی اور ثانی الذکر کو کلاسیک کہا جاتا ہے۔یہ اصطلاحات اگرچہ گمراہ کن ہیں اور ان سے تکلیف دہ الجھاؤ پیدا ہوا ہے اور جو اور بھی زیادہ ہو گیا جب ہم قدیمی شاعری کو صورت پذیر plastic کے ساتھ ساتھ کلاسیک بھی کہنے لگے۔خصوصاً اس میں غلط معانی کے جرثومے موجود تھے،کیوں کہ فن کاروں کو اپنے مواد کو صورت پزیری کے رنگ میں

لینا چاہیے۔عیسائی ہوخواہ ملحد،مضمون کوواضح خطوط میں پیش کرنا چاہیے۔مختصراً جدید رومانوی اور پرانے فن میں صورت پذیری کی تشکیلات کو اہم ضرورت ہونا چاہیے ۔اور،حقیقاً دانتے کی ڈیوائن کامیڈی''میں کردار یا رافیل کی مصوری اتنی صورت پذیر نہیں جتنی ورجل میں یاھر کیولینیم کی دیواروں پر۔

فرق اس بات میں ہے کہ پرانے فن میں پیش کی گئیں صورت پذیر اشکال اُس تصور سے مماثلت میں ہیں جوفن کار پیش کرنا چاہتا ہے۔چناں چہ مثال کے طور پر اُوڈیسی کی جہاں گردی،ایک آدمی جو لیرٹس کا بیٹا،پینیلو پی کا خاوند اور جس کا نام یولیسس تھا،کی جہاں گردی کے علاوہ کچھ نہیں۔چناں چہ باخوس Bacchus جو''لوور'' میں نظر آتا ہے،سیملی Semele کے پرکشش بیٹے،جس کی آنکھوں میں اُداسی ہے اور نرم ہونٹوں کی محراب میں اکساتی ہوئی شہوت انگیزی ہے،اس کے سوا کچھ اور نہیں۔رومانوی فن میں معاملہ اس کے برعکس ہے: یہاں ایک سورما کی جہاں گردی کی اپنے آپ میں اہمیت ہے۔یہ شاید عمومی طور پر زندگی کی بھول بھلیوں کی علامت ہے۔ہمت بڑھانے کے لیے مغلوب کیا گیا اژدھا گناہ ہے،بادام کا درخت جودور سے ہیرو کی طرف اپنی خوشبو پھینکتا ہے،تثلیث ہے۔خداوند،خدا کا بیٹا اور مقدس روح مل کر ایک دوسرے کو وجود دیتے ہیں،اور ایک ہوتے ہیں جیسے خول ریشہ اور گری مل کر بادام کو وجود دیتے ہیں ۔جب ہومر ایک سورمے کی زرہ بکتر کا جو بے شمار بیلوں کی قمیت کے برابر ہے،بیان کرتا ہے،تو وہ اچھے زرہ بکتر کے علاوہ کچھ نہیں۔لیکن جب قرون وسطیٰ کا پادری اپنی نظم میں مریم مقدس کے ملبوس کو بیان کرتا ہے،آپ تیار رہیے،اس ملبوس کی سلوٹ میں کسی خاص نیکی کی علامت ہوگی،اور بے داغ مقدس مریم کے پاک چوغوں میں مخصوص معنی پنہاں ہیں،جیسے اُن کا بیٹا بادام کی گری ہے،انہیں نظم میں مناسب طور پر بطور بادام کا بہار پر آنا کہا گیا ہے۔قرونِ وسطیٰ کی اس شعر گوئی کی یہ خاصیت ہے جسے ہم نے رومانوی'' کا خطاب دیا ہے۔

کلاسیک فن صرف محدود finite غیر مطلق کی نقاشی کرتا ہے اور اس کی ہیئتیں فن کار کے تصور سے ہم آہنگ ہیں۔رومانوی فن نے پیش تو کرنا تھا،یا کسی حد تک علامت کے ذریعے غیر مطلق اور روحانی کی تجسیم تو کرنا تھی،چناں چہ وہ مجبور ہو گیا تھا کہ روایتی نظام کی طرف رجوع کرے یا دوسرے الفاظ میں مکافی،علامتیں استعمال کرنا لازم تھا،جیسے حضرت عیسیٰ نے دل آویز اخلاقی حکایات سے اپنے روحانی افکار بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔چناں چہ قرون وسطیٰ کے فن کی متصوفانہ،رمزیہ،معجزاتی اور ماورائی پیش کش۔خیال آفرینی مقرونی امیجز کے ذریعے اس کو پیش کرنے کی مضطربانہ کوشش کرتی ہے جو خالصتاً روحانیت ہے،اور اس کوشش میں بے شمار نامعقولیات کو ایجاد کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے،یہ جنت میں

جانے کے لیے Ossa کو Pelion پر اور Parcival کو Titurel پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح کا خوفناک قسم کا تصوراتی اسقاط سکنیدای نیوین لوگوں، ہندوؤں اور دوسری نسلوں نے شاعری کے ذریعے تخلیق کرنے کی جستجو کی ہے جو لامحدود کی نمائندگی کرتا ہو، وہاں ہمیں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جنہیں رومانوی کہا جاسکتا ہے۔

قرون وسطیٰ کی موسیقی بارے میں زیادہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس سلسلے میں ریکارڈ نامکمل ہے۔ سولہویں صدی کے آخر سے پہلے تک کیتھولک کلیسا کی موسیقی وجود میں آئی اور اُن کے اپنے طور زیادہ تعریف کے اہل نہیں کہ وہ عیسایت کی خالص ترین روحانیت کا اظہار ہے۔ لحسنیہ فنون، جو اپنے مزاج کے اعتبار سے روحانی تھے، دنیائے عیسایت میں مناسب طریقے سے پھلے پھولے۔ لیکن یہ مذہب صورت پذیر فنون کے لیے ناموافق تھا کیونکہ آخرالذکر نے روح کی مادہ پر برتری کو پیش کرنا تھا اور وہ اس پیش کش میں مادے کو ایک ذریعہ بنانے پر مجبور تھے۔ اُنہیں ایک غیر قدرتی کام سرانجام دینا پڑا۔ چناں چہ ایسے مجسموں اور تصویروں کی بہتات تھی جن میں ناخوشگوار تصالیب، دم توڑتے رِشی اور عمومی طور پر جسمانی اذیتیں تھیں۔ ان مضامین کا اسلوب فن کاروں کے لیے ایک اذیت رہا ہوگا۔ جب میں اُن مسخ شدہ نقوش کو دیکھتا ہوں جن کے ایک طرف کو جھکے ہوئے سر، لمبے سوکھے بازو، کمزور ٹانگیں اور بھدے لٹکن پردے جن کا مقصد عیسائیت کے اجتناب اور ملکوئیت کو پیش کرنا ہے، تو میرا دل اُن فن کاروں کے لیے ناقابل بیان ہمدردی سے بھر جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مصوروں کو کسی حد تک ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ رنگ جو مجسمہ سازوں کی پیش کش کا ذریعہ تھے، اپنے عکسِ ناپذیری میں، بوقلموں، روشنی اور سائے میں، اتنے مکمل طور پر روحانیت کے برعکس نہیں تھے۔ لیکن وہ مصور بھی صابر کینوس کو ناشگوار جسمانی اذیتوں کی پیش کش سے بد شکل کرنے پر مجبور تھے۔ درحقیقت ہم جب بعض گیلریوں میں جاتے ہیں، اور نگاہ دوڑانے پر ہمیں خون، تازیونوں اور پھانسیوں کے نظارے دیکھنے کو ملیں گے، تو ہم یہ ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ پرانے اساتذہ نے ان تصویروں کو جلادوں کی گیلریوں کے بطور بنایا تھا۔

لیکن انسانی عقل بدنمائی کی شکل تبدیل کرسکتی ہے، اور بہت سے مصور اس غیر قدرتی کام کو خوبصورتی اور رفعت اور حسن و دلکشی کے ساتھ پورا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ سچ ہے خصوصاً اطالوی مصوروں نے کسی حد تک روحانیت کے عوض خوبصورتی کو بڑھایا اور اپنے آپ کو اُس قابلیت کے جوہر تک بلند کیا جو میڈونا کے بے شمار فنی نمونوں میں کمال تک پہنچا۔ جہاں تک میڈونا کا تعلق تھا، اُس کی وجہ سے اہل کلیسا شہوانیت پر قدرے رعایت سے کام لے لیتے۔ بے داغ خوبصورت جسم کا عکس، مادرانہ غم اور دکھ

سے تبدیل شدہ، مقدم ٹھہرا تھا کہ اس نے شاعر اور مصور سے نذرانہ وصول کیا، اور اُس فسوں کا حامل جو حیات کو رجھا سکتا تھا۔ یہ عکس ایک کشش رکھتا تھا جس نے عوام کو عیسائیت کے گھیرے میں کھینچا۔ میڈونا عیر یا کیتھولک کلیسا کی خوبصورت dame du comptoir تھی، جس کے پیروکار، خاص کر شمالی علاقوں کے وحشی تھے جس نے اُنہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور اپنی ملکوتی مسکراہٹ سے جکڑے رکھا۔

قرون وسطیٰ میں فن تعمیر کی بھی دوسرے فنون جیسی خصوصیات تھیں، کیوں کہ، یہ واقعتاً اس دور میں زندگی کے تمام مظہرات سے کمال خوبی سے ہم آہنگی رکھتی تھیں۔ شاعری کی طرح فن تعمیر میں بھی تمثیلی رجحان واضح تھا۔ اب، جب ہم ایک گرجے میں داخل ہوں، ہمیں بمشکل ہی اس کے پتھروں کی رمزیت کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے۔ ہمارے ذہن پر صرف ایک عمومی تصور قائم ہوتا ہے۔ ہمیں روح کی سرفرازی اور گوشت پوست کی شرمساری کا احساس ہوتا ہے۔ گرجے کا اندرونی حصہ کھوکھلی صلیب کی طرح ہے اور ہم یہاں شہادت کے وسیلوں کے درمیان پھر رہے ہوتے ہیں۔ مختلف اللون کھڑکیاں ہم پر اپنی سرخ اور سبز روشنی ڈالتی ہیں، خون اور زرد آب دیوتا کے قطروں کی طرح، تعلیمی راستوں میں دعائے مغفرت گونجتی ہے، ہمارے قدموں کے نیچے لوح مزار اور انحطاط ہیں، دیوقامت ستونوں سے مطابقت کے ساتھ، روح بلندی پر پرواز کرتی ہے، دردانگیز طور پر خود کو جسم سے الگ کرتے ہوئے، جو اتارے ہوئے لبادے کی طرح زمین پر گر جاتا ہے۔ جب کوئی ان ''گوتھک'' گرجوں کے بغیر جائزہ لے، یہ بہت بڑے ڈھانچے، جنہیں ہوادار رکھ کر تعمیر کیا گیا ہے، اتنی نزاکت سے، اتنی نفاست سے اتنے شفاف کہ جیسے Brabant کی ڈوریاں جو سنگ مرمر سے بنائی گئی ہوں، تب ہی اس فن کی عظمت کا احساس ہوتا ہے جو پتھر پر غلبہ پاسکتی تھی، تاکہ یہ بہت سخت جوہر بھی روح کی طرح ہلکا لگے، اور عیسائی روحانیت کا ترجمان ہو۔

لیکن فنون صرف زندگی کا آئینہ ہیں، اور جب کیتھولزم روزمرہ زندگی سے خارج ہو گیا، یہ بھی فنون سے غائب ہو گیا۔ ریفارمیشن Reformation کے دور میں یورپ میں کیتھولک شاعری بتدریج دم توڑ رہی تھی؟ اور اس کی جگہ ہم عرصے سے مدفون یونانی طرز کی شاعری کا احیا دیکھتے ہیں۔ یہ صرف ایک مصنوعی بہار تھی، جو سورج کا نہیں مالی کا کام تھا؛ درخت اور پودے تنگ گملوں میں لگے ہوتے تھے، اور شیشے کا آسمان اُن کی ہَوا اور ٹھنڈے موسم سے حفاظت کرتا تھا۔

دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ دوسرے کا براہ راست نتیجہ نہیں، بلکہ تمام واقعات باہمی طور پر ایک

دوسرے کے عمل پر ردِعمل کرتے ہیں۔ یہ صرف یونانی علما کی وجہ سے نہیں تھا جو قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ہماری طرف ہجرت کر آئے، کہ یونانی فن کے لیے محبت، اور اس کی نقالی کی کوشش، ہمارے لیے آفاقی ہوگئی، لیکن فن بطور زندگی کے لیے، ہم عصر پروٹسٹنزم میں حرکت تھی۔ لیوا یکس، عظیم الشان Medici اتنا ہی پُرجوش پروٹسٹنٹ تھا جتنا کہ لوتھر، اور جیسا کہ ''وٹنبرگ'' میں لاطینی نثر میں احتجاج کیا گیا، اسی طرح ردم میں رنگوں، پتھروں اور ottava rime میں احتجاج کیا گیا۔

(A stanza of eight lines, 11-syllabled in Italian, 10-syllabled in English, rhyming as abababcc. (Editor)

کیا مائیکل اینجلو کے سنگ مرمر کے مضبوط مجسمے، گولیورومینیو کے ہنستے ہوئے پن پری چہرے، ''اور ماسٹر لوڈوویکو'' کے (Master Ludovico سے مراد ہے Ariosto، ایڈیٹر) زندگی کی خوشی کے مسحور اشعار، پرانے اور مرجھائے ہوئے کیتھولزم کا تضاد پیش نہیں کرتے ہیں؟ اطالوی مصوروں نے پادریت کا بہتر طریقے سے مقابلہ کیا، شاید ''سیکسن'' علمائے دین سے زیادہ۔ Titian کی تصویروں میں چمکتا ہوا جسم، ___ یہ خالص پروٹسٹینزم ہے۔ وینس کے اعضا جرمن پادری کے وٹنبرگ کے گرجے کے باہر لٹکائے ہوئے [مجسموں] سے زیادہ بنیادی نظریہ رکھتے ہیں۔ انسانیت نے اچانک اپنے آپ کو ہزار سالوں کی غلامی سے آزاد پایا، خصوصاً فن کاروں نے دوبارہ آزادی کا سانس لیا۔ جب ''الپ'' کی طرح کا عیسائیت کا بوجھ اُن کی چھاتیوں سے اُتر گیا۔ وہ جوش وخروش سے یونانی عیش وعشرت کے سمندر میں کود گئے، جس کے جھاگ سے حسن کی دیوی اُنہیں ملنے کے لیے دوبارہ اُبھری۔ مصوروں نے دوبارہ اولمپس کی خوشیوں کا اظہار کیا، سنگ تراشوں نے پرانی چاہت کے ساتھ سنگ مرمر کے ٹکڑوں سے پرانے سورما تراشے، شاعروں نے دوبارہ Atreas اور Laios کے گھرانے کے گیت گائے! کلاسیک شاعری کا ایک نیا دور اُبھرا۔

فرانس میں، لوئی چہاردہم کے دور میں اس نیو۔کلاسیك شاعری نے ایک چمکدار تکمیل کی نمائش کی، اور، کسی حد تک، تخلیقیت کی بھی۔ عظیم بادشاہ کے سیاسی اثر ورسوخ کے تحت یہ نئی کلاسلک شاعری باقی یورپ میں پھیل گئی۔ اٹلی میں جہاں یہ پہلے ہی اپنا مقام بن چکی تھی، اسے فرانسیسی نقوش ملے۔ Anjous ہسپانیہ میں اپنے ساتھ فرانسیسی المیے کے سورما لائے۔ یہ مادام ہینر یتا کے ہمراہ انگلستان گئی، اور قدرتی بات ہے ہم جرمنوں نے اپنے فن کے مندر کو پاؤڈر لگے ورسیلز کے اولمپس کے خطوط پر استوار کیا۔ اس مندر کا بڑا پادری گوٹ شیڈ Gottsched تھا۔ وہ بوڑھا مصنوعی بالوں والا،

جس کا ہمارے عزیز گوئٹے نے اپنی یادداشتوں میں برجستگی سے ذکر کیا ہے۔

''لیسنگ'' وہ ادبی ''آرمنیس'' تھا جس نے ہمارے تھیٹر کو غیر ملکی حکومت سے آزادی دلائی۔ اُس نے ہمیں فرانسیسی سٹیج کی بوزنیت کا پھیکا پن، لایعنیت، بے ذائقہ پن دکھایا، جو بذات خود یونان کی نقل تھا۔ نہ صرف اپنی تنقید بلکہ اپنے فن پاروں کی وجہ سے بھی وہ جدید، طبع زاد جرمن ادب کا بانی بن گیا۔ اس شخص نے تعقل کے تمام راستے، زندگی کے سارے مراحل بے غرض جوش وخروش سے جاری رکھے۔ فن الٰہیات، عتیقات، شاعری، ڈرامائی تنقید، تاریخ ___ اُس نے تمام کا اُسی شوق اور مقصد سے مطالعہ کیا۔ اُس کے تمام کام میں وہی بڑا سماجی تصور سانس لیتا ہے، وہی استدلال کا مذہب، جس میں وہ سنت جانJohn تھا اور جس کے مسیحا کے ہم ابھی بھی منتظر ہیں۔ اُس نے ہمیشہ اس مذہب کا پرچار کیا، لیکن افسوس، اکثر بالکل اکیلے اور صحرا میں۔ مزید برآں، اُس میں پتھروں کو روٹی میں بدل دینے کی مشاقی نہیں تھی۔ اُس کی زندگی کا زیادہ حصہ غربت اور بدحالی میں گذرا، ایک لعنت جو تمام بڑے جرمن دماغوں کے حصے آئی، اور جس پر صرف سیاسی آزادی سے قابو پایا جاسکتا تھا۔ لیسنگ کو سیاسی سوالات سے سوچ سے زیادہ سے گہری دلچسپی تھی، ایک ایسی خصوصیت جو ہمیں اُس کے معاصرین میں نظر نہیں آتی۔ ہم اب سمجھ سکتے ہیں کہ Emilia Golotti میں گھٹیا استبدادیت کے بیان سے اُس کے ذہن میں کیا تھا۔ اُس وقت اُسے صرف تعقلی آزادی کا معرکہ مارنے سے غرض تھی اور پادریوں کے عدم تحمل کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔ اُس کی الٰہیاتی تحریریں زیادہ سمجھی جاتی تھیں۔ ''انسانی نسل کی تعلیم سے متعلق'' ٹکڑے جن کا فرانسیسی زبان میں ''یوجین روڈریگو'' نے ترجمہ کیا ہے، شاید فرانسیسیوں کو لیسنگ کے جوہر قابل کی وسعت کا تصور دینے کے لیے کافی ہے۔ اُس کے دو تنقیدی کام جن کا فن پر گہرا اثر پڑا، Hamburger Dramaturgie اور Laocoon or Concerning the Limits of Painting and Poetry اُس کی بہترین ڈرامائی تخلیقات ہیں۔

گوتھولڈ ایفریم لیسنگ 22 جنوری 1729 کو Kamenz کے مقام پر پیدا ہوا جو Upper Lusatia میں ہے، اور 15 فروری 1781 کو Brunswick کے مقام پر فوت ہوا۔ وہ مکمل آدمی تھا، جو ایک طرف اپنے دلائل سے فرسودہ خیالات کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا، اور ساتھ ہی اس نے کچھ نیا اور بہتر تخلیق کیا۔ ایک جرمن مصنف نے لکھا، ''وہ اُن پاک یہودیوں جیسا تھا جو زیارت کی دوسری منزل پر اپنے دشمنوں کے حملوں سے اکثر پریشان ہوتے اور ایک ہاتھ سے اپنے دشمن سے لڑتے، جب کہ دوسرے کے ساتھ وہ خدا کے گھر پر اپنا کام جاری رکھتے۔'' یہاں لیسنگ پر اس سے زیادہ بات کرنا موزوں

نہیں، لیکن میں یہ کہنے سے نہیں رہ سکتا کہ ادب کی تاریخ کی وسیع حدود میں، میں اس مصنف کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔

میں ایک اور مصنف کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جس نے اُسی جذبے اور مقصد کے ساتھ کام کیا، اور جسے لیسنگ کا جائز ترین وارث کہا جا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس مصنف پر تنقید یہاں بے جا ہوگی کیوں کہ ادب کی تاریخ میں اُس کا خاص ایک علیحدہ مقام ہے، اور اُس کا اپنے دور اور ہم عصروں کے ساتھ تعلق آج بھی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ ''جوہان گوٹھر ائڈ ہرڈر'' 1744 میں Morungen in East Prussia میں کے مقام پر پیدا ہوا اور Weimer کے مقام پر 1803 کو فوت ہوا جو Saxony میں ہے۔

ادب کی تاریخ ایک بڑا مردہ خانہ ہے، جہاں پر کوئی اُن مردوں کو ڈھونڈتا ہے جو اُسے عزیز یا پیارے ہیں۔ اور متعدد چھوٹے آدمیوں کی لاشوں میں جب میں کسی لیسنگ یا کسی ہرڈر کے پروقار نقوش دیکھتا ہوں، تو میرا دل جذبات سے دھڑکنے لگتا ہے۔ بھلا میں تمہارے پیلے ہونٹوں کا جلدی میں بوسا لیے بغیر کیسے گزر سکتا ہوں؟

اگر لیسنگ نے موثر انداز سے فرانکو_ گریشین فن کی غلامانہ بوزنیت کے چشموں کو ختم کیا، تاہم یونانی غلامانہ فن پاروں کی طرف توجہ دِلا کے، اس نے کسی حد تک نقالی کی ایک اور احمقانہ قسم کو قوت محرکہ دی۔ مذہبی توہم پرستی کے خلاف اپنی جنگ کے ذریعے اُس نے ایک مخصوص تنگ نظر نحیف و نزار روشن خیالی کو پیش کیا، جو اُس وقت برلن میں اپنی ڈینگیں مارتی تھی۔ تقدس مآب نکولائی اس کے اہم ترجمان تھے، اور جرمن انسائیکلو پیڈیا اس کا بارد خانہ۔ بدبخت ترین اوسط درجے کی قابلیت نے اپنا سر اُٹھانا شروع کر دیا۔ ہمیشہ سے زیادہ قابل نفرت_ ضُعفِ عقل، پھیکا پن، اور گھٹیا لوگوں نے خود کو کہانی میں مینڈک کی طرح پھیلا دیا۔

یہ یقین کر لینا غلط ہے کہ گوئٹے کو جو اس وقت منظر پر آ چکا تھا، عمومی طور پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ اُس کے ڈرامے Gotz von Berlichingen اور Werther کو گرمجوشی کے ساتھ قبول کیا گیا۔ لیکن یہ اناڑی کے کام تھے، اس سے زیادہ نہیں، اور ادب کے مندر میں گوئٹے ایک چھوٹی سی خالی جگہ پر قابض تھا۔ جیسا پہلے کہا گیا، لوگوں نے Gotz اور ناول Werther کو خوشی کے ساتھ قبول کیا، لیکن یہ قبولیت مواد کی وجہ سے تھی نہ کہ ان کی فن کارانہ خوبیوں کی بدولت، جن کی کم لوگ تعریف کر سکے۔ ان شاہکاروں میں سے Gotz بہادری کے رومانس کا ایک ڈرامہ تھا، جو اُس دور کا مقبول اسلوب تھا۔

Werther میں لوگوں نے صرف اصلی زندگی کی واردات کا ایک آرائشی بیان دیکھا، یعنی نوجوان یروشلم کی کہانی، جس نے محبت میں مایوس ہو کہ خود کو گولی ماردی جس سے اُس مردہ اور خاموش دور میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ اُس کے رقت انگیز خطوط پر آنسو بہائے گئے، اور یہ فراست سے محسوس کیا گیا کہ جس طرح Werther کو اشرافیہ معاشرے سے الگ کیا گیا، اِس سے اس کی زندگی کی اداسی میں اضافہ ہو گیا ہوگا۔ خودکشی سے متعلق مباحثہ کتاب کو اور بھی نوٹس میں لایا ہوگا؟ چند بیوقوفوں نے Werther کی نقل کرتے ہوئے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا، چناں چہ کتاب نے واضح سنسنی پیدا کی۔ لیکن ''اگسٹ لیفونٹیس'' کی رومانوی داستانوں کی بھی اتنی ہی مانگ تھی، اور آخرالذکر بسیار نویس تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ولف گینگ گوئٹے سے زیادہ مقبول تھا۔ Wieland اُس دور کا عظیم شاعر تھا، اور برلن کا Herr Ramler اُس کا واحد مدمقابل۔ Wieland کی بت پرستانہ طور پر پرستش ہوتی تھی، گوئٹے سے کہیں زیادہ Wieland اپنے رُلا دینے والے گھریلو ڈراموں، اور Kotzebue کے مضحکہ خیز ڈرامے اپنے چھچھورے اور باسی مزاح کے ساتھ سٹیج پر حکمرانی کرتے تھے۔

اس ادب کے ضد میں، پچھلی صدی کے آخری دور میں جرمن میں ایک مکتبِ فکر اُبھرا، ہم نے جسے رومانوی سکول کا نام دیا ہے۔ دو بھائیوں ''اگسٹ ولیم'' اور ''فریڈرک شیلجل'' کو اس مکتبِ فکر کا سربراہ کہا جاتا ہے۔ Jena جہاں یہ دونوں بھائی اپنے متعدد عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ رواج کے مطابق آتے جاتے تھے۔ یہ جگہ وہ منبع تھا جہاں سے یہ جمالیاتی عقیدہ شروع ہوا۔ میں سمجھ بوجھ کر عقیدہ کہتا ہوں، کیوں کہ اِس مکتب کا آغاز پرانے فن پاروں کی تنقید، اور مستقبل کے فن پاروں کے لیے نسخوں سے ہوا۔ ان دونوں میدانوں میں "شیلجئین" ''مکتبِ فکر نے جمالیاتی تنقید کی بہت خدمت کی ہے۔ ماضی کے فن پاروں کی تنقید کرتے ہوئے یا تو ان کی خامیاں اور ادھورے پن کو سامنے لایا گیا، یا اُن کی خوبیاں اور خوبصورتی کو پیش کیا گیا۔ متنازع مباحث فن کارانہ خامیوں اور ادھورے پنوں ظاہر کرتے ہوئے ''شلیجلز'' مکمل طور پر لیسنگ کے مقلد تھے۔ اُنھوں نے اُس کی بڑی جنگی تلوار کو جھپٹ لیا، لیکن ''اگسٹ ولیم شیلجل'' کا بازو بہت کمزور تھا، اور اُس کے بھائی فریڈرک کی نظر تصوف کے بادلوں سے دھندلائی ہوئی۔ اول الذکر کے وار میں وہ طاقت نہیں تھی، اور نا ہی آخرالذکر کی ضرب لیسنگ جتنی کاری۔ تخلیق مکرر تنقید میں، جہاں ایک فن پارے کی خوبصورتی کو واضح طور پر سامنے لانا تھا، جہاں انفرادیت کا نازک سا شعور چاہیے تھا، اور جہاں انہیں قابل فہم بنانا تھا، وہاں شیلجلز' لیسنگ سے بہت آگے ہیں۔ لیکن فن پاروں کے تخلیق کے لئے نسخوں کے بارے کیا کہئے! اس میں بھی شیلجلز وہی خصی پن دکھاتے ہیں

جولیسنگ میں نظر آتا ہے۔موخرالذکر جتنا نفی میں مضبوط ہے۔اُتنا ہی اثبات میں کمزور ہے۔وہ کبھی کبھار ہی کوئی بنیادی اصول طے کرسکتا ہے، اور اُس سے بھی کم ایسے اصول جو صحیح ہوں۔اُس کے ہاں مضبوط بنیادی فلسفے یا تشکیلی نظام کی کمی ہے۔اس سلسلے میں ''شلیجز'' لیسنگ کے مقابلے میں بری طرح کم تر ہیں۔ فشٹے کی عینیت اور ''شلیجلز'' کی فطرت کی فلاسفی کے رومانوی مکتب پر اثرات کے سلسلے میں کئی کہانیاں زبان زدِعام ہیں، اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اول الذکر مکمل طور پر آخرالذکر کا نتیجہ ہے۔تاہم میں زیادہ سے زیادہ Fichte اور Schelling کے منتشر خیالات کے نشانات پہچان سکتا ہوں، لیکن کسی بھی طرح ان میں فلسفے کے نظام کی چھاپ نہیں۔ یہ درست ہے کہ Schelling جو اُس وقت Jena میں لیکچر دے رہا تھا، کا رومانوی مکتب پر کافی اثر تھا۔Schelling کسی حد تک شاعر ہے، یہ حقیقت فرانس میں عمومی طور پر لوگوں کو معلوم نہیں، اور یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ابھی تک فیصلہ نہیں کرسکا کہ فلسفے کے اپنے تمام کام کو شاعری میں چھاپے، جی ہاں، بحر میں ڈھال کر۔یہ بے شک اُس کی خصوصیت ہے۔

لیکن اگر شلیجلز اپنے مکتب شعرا کے اُن فن پاروں کی جن کی اُنہوں نے نشاندہی کی تھی، کوئی حتمی قابل اعتبار نظریہ نہیں دے سکے، تو ان خامیوں کا اُنہوں نے ماضی کا ماضی کے فن کے بہترین نمونوں کے ماڈل بنا کر اور اپنے شاگردوں تک اُن کی رسائی کر کے ازالہ کیا۔ یہ زیادہ تر قرون وسطیٰ کے عیسائی کیتھولک فن پارے تھے۔شیکسپیئر کا ترجمہ، جو اس فن کی سرحد پر کھڑا ہے اور پروٹسٹنٹ صراحت کے ساتھ اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ ہمارے جدید دور میں آتا ہے، اس کا مقصد صرف مناظرانہ ہے، اور جگہ کی کمی اس موجودہ بحث میں مانع ہے۔اسے اے۔ڈبلیو شلیجل نے اُس وقت شروع کیا جب قرون وسطیٰ کے لیے جوش وخروش اپنی انتہائی بلندی کو نہیں پہنچا تھا۔بعد میں جب یہ ظہور پذیر ہوا، Calderon کا ترجمہ کیا گیا اور اُسے شیکسپیئر سے بہت اونچا مقام دیا گیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ Calderon کی کتابوں میں خاص طور پر قرون وسطیٰ کے، خصوصاً سورماؤں کی مہم جوئی اور رہبانیت کی داستانوں کے اثرات نمایاں ہیں___۔قشتالی پادری شاعر کے متبرک طربیہ ڈرامے، جس کے شاعرانہ پھولوں پر مقدس پانی اور کلیسائی خوشبوئیں چھڑکائی گئی ہوں، اپنی تمام تر پاک عظمت، پاپائی شان وشوکت، ریاکارانہ بکواس کے ساتھ اُنہیں ماڈل بنایا گیا، اور جرمنی عجیب وغریب متبرک، دیوانگی سے عمیق نظموں سے بھر گیا، اور یہ فیشن تھا کہ خود کو تعریف کی تصوفانہ خوشی میں مست کیا جائے، جیسا کہ The Devotion to the Cross یا میڈونا کی حرمت کے لیے لڑنا، جیسے The Constant Prince میں ہے۔ Zacharias Werner اس فضول بکواس کو اتنا آگے تک لے گیا جہاں حکام اُسے پاگل خانہ میں بند کر دیتے۔

شیلیجلز نے کہا، ''ہماری شاعری مافوق الفطرت ہے، ہماری فنون لطیفہ کی دیوی بوڑھی اور جھریوں والی ڈائن ہے، ہمارا کیوپڈ خوش رنگ نوجوان نہیں، بلکہ سکڑا ہوا، سفید بالوں والا بونا ہے۔ ہمارے جذبات پژمردہ ہیں، ہمارا تخیل خشک ہو چکا ہے، ہمیں اپنے آپ کو تقویت دینی چاہیے۔ ہمیں سادہ لوحی کے بند چشموں کو ڈھونڈنا چاہیے، قرون وسطیٰ کی سادہ سادہ شاعری، جس میں جوانی کی کیمیا کے بلبلے ہیں۔ جب خشک اور پیاسے جم غفیر نے یہ سنا، اُنہوں نے زیادہ تاخیر سے کام نہیں لیا۔ وہ جوان بننے اور آب وتاب دکھانے کے لیے بے چین تھے، اور اُن معجزیاتی پانیوں کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے، بے اعتدال ندیدے پن سے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے تیزی سے پی گئے۔ لیکن اُن کا مقدر اُس بوڑھی خادمہ سا ہوا جس نے یہ نوٹ کیا کہ اُس کی مالکہ کے پاس جادو کا آب شباب ہے جو جوانی کو واپس لے آتا ہے۔ اپنی مالکن کی غیر حاضری میں اُس نے غل خانے کی دراز سے کیمیا والی صراحی اُٹھائی، لیکن چند قطرے پینے کے بجائے لمبا گھونٹ لیا تاکہ دوبارہ جوان کرنے والا مشروب پی کر وہ نہ صرف جوان ہو جائے بلکہ چھوٹی سی دودھ پیتی بچی بن جائے۔ ہمارے اچھے Ludwig Tieck کے ساتھ جو اس مکتب کے بہترین شاعروں میں سے تھا کچھ ایسا ہی ہوا۔ اُس نے قرون وسطیٰ کی لوک کہانیوں اور داستانی گیتوں کو اس شوق سے پیا کہ وہ دوبارہ بچہ بن گیا، اور اُس میں بچوں والا توتلا پن آ گیا، جس کو بیان کرنے کے لیے میڈم De Stael کو اتنی تکلیف اُٹھانا پڑی۔ وہ اقرار کرتی ہے، ایک ڈرامے میں کرداروں میں سے ایک کردار کا اپنے پہلے داخلے پر ''میں بہادر Bonifacius ہوں، اور یہ بتانے آیا ہوں'' وغیرہ کہنا عجیب لگا۔

اپنے رومان سے ''Sternbald Wanderungen'' اور اُس کے Herzensergies sungen eines kunstliebenden کے چھپنے کے بعد جسے کسی Wacenroder نے لکھا تھا، Cudeg Tieck نے فن کو بطور ماڈل بنانے کا بے ڈھنگا، ناتجربہ کار فیصلہ کیا۔ اِن کاموں کی خدا پرستی اور بچگانہ پن، جو اِن کے تکنیکی بے ڈھنگے پن میں ظاہر ہوا، اِن کی نقل کرنے کی سفارش کی گئی۔ رافیل کو مکمل طور پر نظر انداز کرنا تھا۔ اُس کے اُستاد Peraginno کا بھی اُس جیسا ہی انجام ہوا، گو اُسے قدرے بہتر سمجھا گیا، کیوں کہ یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ اُس کے ہاں اُس حسین فن کے نشانات ملتے تھے جو Fra Giovanno Angelico da Fiesole کے ہاں پورے جوبن میں دیکھنے کو ملتے ہیں، اور جن کی عقیدت سے تعریف کی گئی۔ اگر قاری اُس دور کے اشتعانِ فن کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتا ہے کہ کس طرح اس دور میں شاعری کی جملہ اشکال قرون وسطیٰ کی تقلید

کی، اُسے Charenton کے پاگل خانے جانا چاہئے اور Louvre جانا چاہیے، جہاں اُس دور کے اُستادانِ فن، جن کی بے انتہا پرستش کی جاتی تھی، کی بنائی تصویروں کی آج بھی نمائش کی جاتی ہے۔

بحرکیف، میرے خیال میں Louvre کے پہلے سیلون میں رکھی گئی تصویریں ابھی تک اتنی تجیلی ہیں کہ وہ دیکھنے والے کو اُس دور کے فن کارانہ آئیڈیلز کا صحیح شعور نہیں دیتیں۔ پرانے اطالوی سکول کی تصویریں تصور کیا جانا ضروری ہے کہ ان کے پرانی جرمنی میں ترجمے ہوئے، کیوں کہ پرانے مصوروں کے کام غیر فن کارانہ اور بچگانہ سمجھے جاتے تھے، چناں چہ پرانے اطالوی شاہکاروں سے زیادہ قابل تقلید سمجھے گئے۔ یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ ہم جرمن، Gemuth کے ساتھ، اس لفظ کا فرانسیسی میں کوئی مترادف نہیں، دوسری قوموں سے زیادہ عیسایت کا تصور واضح کر سکے ہیں، اور فریڈرک شلیجل، اور اُس کے دوست قدیم Rhine کے شہروں میں اُن پرانی جرمنی تصویروں اور مجسموں کی باقیات کی چھان بین میں لگے رہے جن کی مقدس تبرک کے طور پر تو ہمانہ پرستش ہوتی تھی۔

میں نے ابھی اُس دور کے جرمن Parnassus کے ساتھ مقابلہ کیا، گو یہ ایک معتدل سا مقابلہ ہے۔ ایک فرانسیسی پاگل پن، جو جرمن دیوانگی سے شدت میں بہت کم ہے، کیوں کہ جیسا کہ Polonius کہے گا ہی، آخرالذکر میں ایک ڈھنگ ہے۔ لفظی شعبدہ گری کے ساتھ جس کی مثل نہ تھی، ساتھ ہی شدید با ضمیری، ایک گھمبیرتا جس کا ایک سطحی فرانسیسی احمق کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکتا، اس جرمن بیوقوفی کو جاری رکھا گیا۔

جرمنی کی سیاسی حالت اُن پرانے جرمن عیسائی رجحانات کے لیے سودمند تھی۔ ایک کہاوت ہے کہ ضرورت عبادت سکھاتی ہے، اور حقیقتاً جرمنی میں اس کی بہت ضرورت تھی۔ چناچہ عوام الناس کا رجحان عبادت مذہب اور عیسائیت کی طرف زیادہ تھا۔ جرمنوں سے زیادہ کوئی بھی عوام اپنے حاکموں کے وفادار نہیں۔ اُنہیں دکھ تھا کہ جنگ اور بیرونی تسلط کی وجہ سے ملک کس مقام تک پہنچ گیا ہے اور مفتوح شہزادوں کا نپولین کے قدموں میں رینگنا اُن کے لیے اندوہ ناک نظارہ تھا۔ پوری قوم اُن بوڑھے وفادار ملازموں سے مشابہہ تھی جو کبھی بڑے مگر اب چھوٹے خاندانوں سے وابستہ ہیں، اُن بے عزتیوں کو جو اُن کے مالکوں کو سہنا پڑتیں، اُنہیں اپنے مالکوں سے زیادہ محسوس کرتے تھے اور جب چاندی کی کراکری، کٹلری وغیرہ بکتی تو بہت روتے، چوری چھپے اپنی برائے نام بچت اکٹھی کر لیتے تا کہ خاندانی طعام کی میز پر رئیسوں والی موم بتیوں کے بجائے جانوروں کی چربی نہ جلائی جائے ___ بالکل جس طرح ہم پرانے ڈراموں دیکھتے ہیں۔ عالم گیر اداسی کو مذہب میں سکون ملا، اور اس کی پیروی میں خدا کی

رضا کے آگے ہتھیار ڈالے، صرف جس سے مدد مل سکتی تھی۔ حقیقت میں نپولین کے خلاف خدا کے علاہ کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ زمینی جم غفیر پر اعتبار نہیں کیا سکتا تھا، چناں چہ تمام آنکھیں جنت کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

ہم نے چپکے سے نپو لین کے آگے ہتھیار ڈال دئے ہوتے لیکن جہاں ہمارے شہزادوں کو عرش سے مدد کی امید تھی، ساتھ وہ اس خیال سے بھی متفق تھے کہ اُن کی رعایا کی ملی جلی طاقت اُن کے مقصد کے بارآور ہونے میں مددگار ثابت ہوگی۔ چناں چہ اُنہوں نے جرمن عوام سے یک رنگی کا احساس چاہا، ممتاز شخصیتیں بھی جرمن قومیت کی بات کرتی تھیں، مشترک جرمن پدر وطن کی ''عیسائی۔ جرمن'' نسلوں کے ملاپ کی، جرمنی کے اتحاد کی_ ہمیں حکم دیا گیا محبِ وطن بنیں اور ہم فوراً محبِ وطن بن گئے___ کیوں کہ ہمارے شہزادے جب بھی حکم دیں، ہم بجالاتے ہیں۔

ایسے وقت میں جب نپو لین کے خلاف جہاد ترتیب دیا رہا تھا، اُس وقت ایک ایسا مکتب جو ہر اُس فکر کا جو فرانسیسی تھی، دشمن تھا، اور جس نے فن اور زندگی کی ہر اُس چیز کو باوقار بنایا جو Teutonic تھی، وہ زیادہ مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اُس وقت رومانوی مکتب اور حکومتی سازشیں اور خفیہ انجمنیں ایک دوسرے کے ساتھ گھی شکر تھیں، اور A.W.Shlegel نے Racine کے خلاف اُسی مقصد کے ساتھ سازش کی، جس طرح وزیر Stein نے نپو لین کے خلاف منصوبہ تیار کیا تھا۔ یہ مکتبہ آداب وقت کی ندی کے ساتھ بہتا رہا، کہنے کا مقصد ہے کہ یہ ندی کے منبع کی طرف الٹا بہتا رہا۔ آخر کار جب جرمن حب الوطنی اور قومیت فاتح ہوئیں، ''نیا جرمن ۔ مذہبی ۔محبِ وطن روحانی مکتب بھی کامیاب ہوا۔ عظیم کلاسک نپو لین، جو سکندر اعظم اور سیزر کی طرح کلاسک تھا، اُس کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور آگسٹ ولیم اور فریڈرک شلیجل، جو ادنیٰ رومان پرست تھے اور اُتنے ہی رومان پسند جتنا ٹام تھمب اور Puss in Boots، اب فاتحوں کی طرح اکڑے پھرتے تھے۔

زیادتی یا تجاوز کے بعد ردعمل نے آنے میں کبھی دیر نہیں کی۔ جیسے عیسائی روحانیت شاہی رومی حکومت کی ظالم حکمرانی کی مادیت کے خلاف ردعمل تھی، جیسے یونانی فن اور سائنس کی محبت کا احیا عیسائی روحانیت کی بے اعتدالی کے خلاف ردعمل تھا، جیسے قرون وسطیٰ کی رومانویت کو پرانے کلاسک فن کی بے رس نقالی کے خلاف ردعمل سمجھا جائے، چناں چہ اب ہم کبھی اُس کیتھولک جاگیردارانہ سوچ کے طریقے، وہ سورمائی قصے اور پادریت جو ادب اور فن مصوری کے ذریعے حیران کن حالات میں ذہن نشین کرائی جارہی تھیں، کے خلاف ردعمل کو دیکھتے ہیں۔ جب قرون وسطیٰ کے مصوروں کو ماڈل کے طور پر پیش کیا گیا اور ان

کی ستائش وثنا کی گئی، اُن کی برتری کی صرف ایک وجہ بتائی گئی کہ وہ لوگ اپنے اظہار میں یقین رکھتے تھے،اور چناں چہ وہ اپنے غیرفن کارانہ نظریوں کی بدولت تشکیکی مزاج والے فن کاروں سے زیادہ کامیابی حاصل کر سکتے تھے، باوجودیکہ آخرالذکر کوفنی مہارت میں بہت آگے برتری تھی۔مختصراًیہ دعویٰ کیا گیا کہ عقیدہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیتا ہے،حقیقتاً Fra Angelico da Fiesole یا Brother Ottfried کی نظموں کے عمدہ خواص کو کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے؟ چناں چہ جوفن کار اپنے فن کے عقیدے میں سچے تھے،اور جنہوں نے اُن معجزاتی تصویروں کی مقدس مسخ شدگی کی نقل کرنا چاہی، حیرت انگیزی سے لبالب اُن نظموں کا بے ہنگم پن، پرانے کاموں کی نا قابل بیان پراسراریت ـــــ یہ فن کار مصمم ارادے سے شاعری کے اُس مقدس چشمے کی طرف بھٹک کر جانا چاہتے تھے جہاں سے پرانے اُستادوں کوشاعری کی مافوق الفطرت تحریک ہوا کرتی تھی۔وہ روم کی زیارت کو گئے جہاں حضرت عیسیٰ کے نائب مختار نے مدقوق جرمن فن کو گدھوں کے دودھ سے نئی قوت عطا کرنا تھی ۔مختصراً، وہ خودکو رومـــــن ۔ کیتھـــولك حواریانہ چرچ کے دامن میں لے گئے، جہاں اُنہوں نے عقیدے کے مطابق ،نجات حاصل کرنا تھی ۔ رومانوی مکتب کو کئی ماننے والے ، مثال کے طور پر، Joseph Gorrees اور Clemens Brentano پیدائشی طور پر کیتھولک تھے اور انہیں کیتھولک عقیدے کے ساتھ دوبارہ وابستگی کے لیے کسی قسم کی رسمی تقریب کی ضرورت نہیں،اُنہوں نے صرف اپنے آزادخیال نظریات کوترک کر دیا۔اگر چہ کئی دوسرے،مثلاً

فریڈرک شلیجل ، Adam muller ,Carove', Shutz, werner, Novalis, Ludwig Tieck وغیرہ کی پروٹسٹنٹ کے طور پر پرورش ہوئی اور اُن کو کیتھولزم کی قبولیت کے لیے عوامی تقریب کی ضرورت تھی۔اوپر دی گئی فہرست میں صرف مصنفین شامل ہیں، بڑی تعداد میں مصور، جو بیک وقت پروٹسٹنٹ سوچ اور دلیل سے منکر ہو گئے،اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

رومانوی مکتب

(حصہ دوم)

میں نے تعقلی آزادی اور Protestantism کا اکٹھے ہی ذکر کیا ہے، اگر چہ، جب میں جرمنی میں پرٹسٹنٹ عقیدے کا دعویٰ کرتا ہوں، پھر بھی مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی مجھے اس کے حق میں جانب دار ہونے کا الزام نہیں دے گا۔ یہ کسی جانب داری کے بغیر ہے کہ میں نے Protestantism اور آزاد خیالی کو ساتھ رکھا ہے، کیوں کہ جرمنی میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھتے ہیں۔ تمام حالات میں وہ لگے ہیں، ماں اور بیٹی کی طرح۔ یقیناً اگر پروٹسٹنٹ چرچ پر قابل نفرت تنگ نظری کا یہ الزام لگایا جائے، ہم پھر بھی اس کی لافانی عزت کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی مذہب میں آزادانہ تفتیش کا حق دے کر، اور آدمیوں کے ذہنوں کو مذہبی حتمی پن کے طوق سے آزادی دلا کر، جرمنی میں آزاد خیالی کو جڑ پکڑنے اور سائنس کو اپنے خود مختار وجود کے ارتقا کا موقع فراہم کیا۔ اگر چہ جرمن فلسفہ فخر سے پروٹسٹنٹ چرچ کے ساتھ ساتھ اپنے مقام کا تعین کرتی ہے، یہاں تک کہ خود کو برتر تصور کرتی ہے، پھر بھی یہ آخر الذکر کی بیٹی ہے، اور اس لئے اپنے ماخذ کی عزت و تکریم اس پر واجب ہے، اور جب اسے یسوعیت سے خطرہ لاحق ہوا، جو دونوں کی دشمن ہے، خاندانی بندھن متقاضی ہیں کہ وہ اس دشمن کے خلاف باہمی دفاع ترتیب دیں۔ تعقلی آزادی اور پروٹسٹنٹ چرچ کے تمام دوست جن میں تشکیک پرست اور قدامت پسند شامل ہیں، بیک وقت کیتھولزم کے احیا کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی طرح، آزاد خیال بھی، جنہیں پروٹسٹنٹ چرچ یا فلسفہ کی بھلائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور صرف اجتماعی آزادی اُن کا مطمحِ نظر تھا، وہ بھی مخالف گروہ میں شامل ہو گئے۔ جرمنی میں اگر چہ موجودہ وقت تک آزاد خیال فلسفے اور مذہب کے طالبِ علم رہے ہیں، اور وہ ہمیشہ ایک ہی نظریے، یعنی آزادی کے نظریے کے لیے کوشاں رہے، چاہے زیر بحث موضوع سیاسی، فلسفیانہ یا مذہبیانہ ہو۔ یہ اُس آدمی کی زندگی سے بہت واضح ہے جس نے جرمنی میں رومانوی مکتب کی ابتدا سے ہی اس کی جڑوں کھوکھلا کرنا شروع کر دیا اور اس کے انخلا میں مدد گار بنا__ میری مراد Johann Heinrich Voss سے ہے۔

یہ مصنف فرانس میں تقریباً گمنام ہے، پھر بھی اور لوگ کم ہی ہیں جن کے جرمن لوگ اپنی علمی ترقی کے لئے مرہون منت ہیں۔ Lessing کے بعد غالباً وہ جرمن آدب کا سب سے اہم نام ہے۔ وہ یقیناً ایک بڑی ہستی تھا اور اُس کا عظیم رتبہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اُس کا تفصیلاً ذکر کیا جائے۔

اس آدمی کی سوانح عمری پرانے مکتب کے تقریباً تمام مصنفین کی سی ہے ۔ وہ غریب والدین کا بیٹا تھااور 175 میں Mecklenberg میں پیدا ہوا ۔ اس نے الٰہیات میں تعلیم حاصل کی مگر اسے بطور پیشہ نہیں اپنایا۔ جب وہ شاعری اور یونانی سے شناسا ہوا، اُس نے خود کو سرگرمی سے دونوں کے لیے وقف کر دیا ۔ فاقوں سے بچنے کے لیے اُس نے پڑھانا شروع کر دیا اور Hadeln میں Otterndorf کے ایک سکول میں معلم ہو گیا۔ اُس نے پرانے مصنفین کے تراجم کیے اور محنت کرتے ہوئے غربت اور کفایت شکاری میں پچھتر برس کی عمر تک جیا۔ پرانے مکتبۂ فکر کے شعرا میں وہ بہت مقبول تھا لیکن نئے روحانوی مکتب کے شاعر اُس کی کامیابیوں کو مسلسل مسترد کرتے ۔ اُنہوں نے اس ایماندار اور پرانے نظریات کے حامل Voss کی تضحیک میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، اور وہ اپنے بے لاگ طریقے سے Elbe کے نچلے علاقوں کی زندگی کی تصویر کشی کرتا رہا۔ اس نے بعض اوقات Plat-Deutschki کی علاقائی زبان میں بھی لکھا۔ اس نے اپنی تصانیف میں قرون وسطیٰ کے سورماؤں یا میڈاناؤں کو ہیرو یا ہیروین نہیں بنایا بلکہ ایک سادہ پروٹسٹنٹ پادری اور اُس کے صالح خاندان کو اپنا موضوع چنا۔ Voss مکمل طور پر اتنا زیادہ دلچسپ، بورژوا، اور بلاتصنع تھا، جب کہ وہ نئے عشقیہ شعرا، ذہنی مریض، خواب خراماں، بلند بانگ اور اشرافی، اور مکمل طور پر غیر قدرتی تھے۔ آوارہ خشوں کے مخمور شاعر فریڈرک شلیجل کو رومان پرست Lucinde، متحمل مزاج اور سنجیدہ Voss کے 'پاک دامن Louise' اور بوڑھے اور قابل احترام پادری "Grunau" بہت بیہودہ لگے ہوں گے۔ آگسٹ ولیم شلیجل، جو اپنے بھائی کی طرح اپنی اسراف پسندی اور عیسایت کی عظمت کے لیے اتنا مخلص نہیں تھا، اُس کا نقطہ نظر بوڑھے voss کے ساتھ کافی مطابقت رکھتا تھا اور دونوں کے درمیان صرف تراجم کی مخاصمت تھی، اور یہ مخاصمت جرمن ادب کے لیے سودمند تھی۔ نئے مکتب کے وجود میں آنے سے پہلے ہی Voss نے ہومر کا ترجمہ کر دیا تھا۔ اب بہت محنت کے ساتھ اُس نے دوسرے پرانے زمانے کے دوسرے کافر شعرا کا ترجمہ کیا جب کہ آگسٹ ولیم شلیجل نے رومانوی_ کیتھولک دور کے عیسائی شاعروں کا ترجمہ کیا۔ خفیہ مذہبی مباحث کے مقاصد نے دونوں کو تحریک دی۔ Voss کا مقصد تراجم سے کلاسک شاعری اور خیالات کی طرز کو آگے بڑھانا تھا، جب کہ اے۔ ڈبلیو۔ شلیجل نے اچھے تراجم کے ذریعے عیسائی_ رومانوی شعرا کو عام لوگوں تک پہچانا چاہا تا کہ اُن نقل اور تہذیب کا جمالیاتی حاصل ہو سکے ۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اس تفساد نے ان دونوں تراجم کی زبان میں خود کو ظاہر کیا۔ شلیجل اپنے اسلوب میں زیادہ نفاست پسند اور پر تصنع جب کہ voss صاف گو اور کھردرا تھا۔ آخرالذکر کے آخری تراجم کی زبان ریتی کی طرح کھردری ہے اور بعض اوقات ناقابل فہم۔ اگر قاری شلیجل کی شاعری کی چمک دار، آبنوس کی طرح کی سطح سے پھسل سکتا ہے تو Voss کی شاعری کے گرینایٹ کے بلاک سے لڑھکنے کے امکانات روشن ہیں۔ مخالفت کے اس جذبے میں Voss نے آخر کار شیکسپیئر کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام شلیجل شروع کے سالوں میں کامیابی سے سرانجام دے چکا تھا۔ اس کام کو voss بخوبی انجام نہ دے سکا اور اُس کے ناشر نے اس کا اور بھی برا حال کر دیا۔ ترجمہ مکمل طور پر ناکام ثابت ہوا۔ اگر شلیجل کا ترجمہ بہت رواں ہے، اگر اُس کی نظمیں پھینٹی ہوئی بالائی کا تاثر دیتی ہیں اور قاری کو اس شک میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ اسے کھانا یا پینا ہے ___ تو دوسری طرف Voss کی نظمیں پتھر کی طرح سخت ہیں اور انہیں اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جبڑا اُتر جائے گا۔ Voss کی تمام مشکلات کے خلاف نبرد آزما ہونے کی اہلیت اُسے دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ اُس نے نہ صرف جرمن زبان کے ساتھ کشتی کی بلکہ یسوعیت کے اُس اشرافی جن کا بھی مقابلہ کیا جس نے جرمن ادب کے گھنے جنگل میں اندر اپنے گھناؤنے سر کو جنبش دی۔ Voss اس نے اس بلا پر کاری ضرب لگائی۔

جرمن مصنف Herr Wolfgang Menzel کو Voss کا سب سے بڑا مخالف تصور کیا جاتا ہے اور وہ اُسے ''اُجڈ سیکسن'' کہتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ خطاب کس نظریے میں دیا گیا لیکن یہ ہے کافی مناسب۔ حقیقتاً، Voss ''اُجڈ سیکسن'' ہے، بالکل لوتھر کی طرح۔، اُس میں شان، رتبہ، اخلاق اور خوش گواری کی کمی تھی، وہ مکمل طور پر اُس گستاخ، کھردری اور جفاکش نسل کا حصہ تھا جن کو صرف تلوار اور آگ سے عیسایت کی تبلیغ کی جاسکتی تھی، اور جو تین جنگیں ہارنے کے بعد مذہب کے آگے سیس جھکاتے ہیں، جن کے طور طریقوں میں اب بھی پرانی نارسوں Norse کفر کی مستقل مزاجی موجود ہے، اور جو اپنی مادی اور تعقلی جنگوں جنگوں میں خود کو اپنے پرانے دیوتاؤں جتنا نڈر اور خوسر ظاہر کرتے ہیں۔ جب میں Johann Heinrich Voss کے مذہبی مباحث اور اُس کے اطوار کے بارے غور کرتا ہوں، تو میرے سامنے ایک آنکھ والا قدیم Odin آجاتا ہے، جو Asgard سے جانے کے بعد Hadlen کے صوبے میں معلم بن گیا ہے اور وہاں چھوٹے، بھورے بالوں والے بچوں کو لاطینی تنزل

اور عیسایت کا سوال جواب نامہ پڑھا تا ہے، اپنے آرام کے وقت میں یونانی شاعروں کا جرمن میں ترجمہ کرتا ہے، اور اشعار کو شکل دینے کے لیے Thor سے بڑا ہتھوڑا اُدھار مانگتا ہے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس مشکل سے تھک جانے کے بعد ہتھوڑا اُٹھا کر بیچارے Fritz Stolberg کے سر پر دے مارتا ہے۔

وہ ایک مشہور معاملہ تھا۔ سٹول برگ کا نواب، فریڈرک پرانے مکتب کا شاعر تھا، اور جرمنی میں اس کی کافی شہرت تھی، یہ شہرت شاعری کے بجائے اُس کے رتبے کی وجہ سے تھی، جسے آج تو کم لیکن اُس وقت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ گوسٹول برگ کا نواب، فریڈرک ایک آزاد خیال اور اچھے دل کا آدمی تھا اور پتریشن سے کم تر نوجوانوں کا دوست تھا۔ یہ لوگ Gottingen میں شاعری کا ایک سکول قائم کرنا چاہتے تھے۔ میں فرانس کی ادبی ہستیوں کو مشورہ دیتا ہوں Holty کی ان نظموں کے پیش لفظ پڑھیں جن میں Voss شاعروں کے اُس گروہ کی دنیا سے لاتعلق زندگی بیان کی گئی ہے جس کے وہ اور سٹول برگ رکن تھے۔ وقت گزر گیا اور نوجوان کے اُس جھرمٹ میں سے صرف یہ دو بچے۔ جب سٹول برگ ھوم دھام کے کیتھولک چرچ میں شامل ہوا تعقل اور آزادی کی محبت سے کنارا کشی کرتے ہوئے، تعقلی اندھیرے کا ممد و مددگار بنتے ہوئے، اور اپنی اشرافی مثال سے کئی کمزور لوگوں کو ساتھ لیے ___ تب Voss، جو ایک باعزت آدمی تھا، کھلم کھلا اپنے بچپن کے دوست کا مخالف ہو گیا اور چھوٹی کتاب Wie Ward Fritz Stolberg ein Unfreier? لکھی۔ اس کتاب میں اُس نے سٹول برگ کی ساری زندگی کا تجزیہ کیا اور دکھایا کہ اس کے پرانے رفیق کے مزاج میں شروع سے ہی کس طرح اشرافیہ رجحانات موجود تھے، اور انقلاب فرانس کے بعد یہ رجحانات مزید نمایاں ہو گئے تھے، اور stolberg نے رازداری کے ساتھ امرا کی ایک تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی تھی جس کا مقصد انقلاب فرانس کے خلاف الزام اُٹھانا تھا، یہ امرا یسوعیوں کے ساتھ ایک اتحاد میں شریک ہوئے، اور یہ کہ انہوں نے، کیتھولزم کے دوبارہ استحکام کے ذریعے امرا کے مفادات کو آگے بڑھانا چاہا۔ اس نے عمومی طور پر اُن اقدام کو بے نقاب کیا جن کے ذریعے قدامت پسند عیسائی_کیتھولك_زمیندار قرون وسطیٰ کا احیا اور پروٹسٹنٹ تعقلی آزادی اور عوام الناس کے سیاسی حقوق کی تباہی چاہتے تھے۔ انقلابیوں کے دور سے پہلے جرمن جمہوریت اور اشرافیہ کے درمیان اچھے تعلقات تھے، اول الذکر کو کوئی اُمید نہیں تھی اور آخر

الذکر کو کسی کا خوف نہیں تھا، لیکن اب عمر رسیدہ، سفید داڑھیوں کے ساتھ، اُنہوں نے آمنے سامنے آ کر زندگی اور موت کی جنگ لڑی۔

جرمن عوام کا وہ حصہ جو اس کشمکش کی اہمیت اور اشد ضرورت کو نہیں سمجھ سکتا تھا اُس نے بے چارے Voss کو خفیہ رشتوں اور ذاتی معاملات کو بے دردی سے فاش کرنے کا الزام لگایا اس معاملے کو اگر صحیح تناظر میں لیا جائے تو وہ صحیح ثابت ہوتا ہے۔ پھر کچھ نام نہاد جمالیاتی حس رکھنے والے افراد، جو اس کم تر الزام تراشی کے سلسلے میں معزز اور نفیس تھے، اُنہوں نے بھی آواز بلند کی اور بے چارے Voss کو افواہ ساز کہا۔ کچھ باعزت شہریوں کو خدشہ تھا کہ اُن کا پردہ فاش ہو جائے گا اور اُن کی خامیاں سب کے سامنے آ جائیں گی، اُنہوں نے خفیہ ادبی مباحث کی راز داری کے مروجہ اصولوں کی خلاف ورزی پر غم و غصے کا اظہار کیا۔ یہ وہ اصول تھے جن کے تحت شخصیات اور ذاتی معاملات پر بحث نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر ایسے ہوا کہ سٹول برگ جلد ہی فوت ہو گیا اور اس کی موت کی وجہ شدید دکھ بتائی گئی۔ جب موت کے جلد بعد اس کی Liebesbuchlein شائع ہوئی جس میں اس نے عیسوی لب ولہجہ اختیار کیا، اور اپنے دھوکا کھائے ہوئے دوست کے متعلق مقدس عیسائی معافی کی اصطلاح میں بات کی ___ تب جرمن دردمندی کے موٹے آنسو تیز رفتاری سے بہے، اور جرمن ''مائیکل'' (مائیکل جان بُل سے ہم آہنگ ہے) نے اپنا مضحکہ خیز لہجہ اختیار کر لیا، اور جذبات کا یہ سیلاب بے چارے Voss کے خلاف غصے میں بدل گیا؛ اس پر زیادہ الزام اُن لوگوں نے لگائے جن کی تعقلی اور بہتری کے لیے وہ کوشاں رہا تھا۔

جب جرمنی میں کسی کی پگڑی اچھالی جائے تو عوام کی اکثریت کی اُس سے ہمدردی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں جرمن قوم اُن بوڑھی عورتوں کی طرح ہے جو کسی کو پھانسی چڑھتے ہوئے بہت شوق سے دیکھتی ہے اور تماش بینوں کی اگلی قطار میں کھڑا ہونا چاہتی ہیں اور دوسرے فریق کی حالت زار پر گریہ زاری بھی کرتی ہے اور اس کی طرف ہمدردی کا ہاتھ بھی بڑھاتی ہے۔ ٹسوے بہاتی بوڑھی عورتیں جب ادبی پھانسیوں کا نظارہ کرتی ہیں اور انتہائی افسردہ شکلیں بناتی ہیں، لیکن اگر گناہگار کو معافی دے دی گئی تو اُنہیں مایوسی ہو گی اور اُنہیں دلچسپ نظارہ دیکھے بغیر گھر کی طرف روانہ کر دیا جائے گا۔ وہ اُن لوگوں کو کبھی معاف نہیں کریں گی جو اُن کی راہ میں رکاوٹ بنے۔

اِسی اثنا میں Voss کی بحث مباحثے والی تحریروں کا لوگوں پر گہرا اثر ہونے لگا، اور قرون وسطیٰ

کے نظریات کی تعریف جو ایک فیشن تھا، اُس نے اُسے تبدیل کر دیا۔ اُس کی تحریروں نے جرمنی کو بیدار کر دیا اور کافی لوگوں نے ذاتی طور Voss کی تائید کی، اکثریت اُس کے نظریے کی حامی تھی۔ تنازع سنگین سے سنگین تر ہوتا گیا۔ حملے اور یاداشتیں یکے بعد دیگر آئیں اور بوڑھے آدمی کے آخری ایام ان جھگڑوں سے بہت تلخ ہو گئے تھے۔ اُسے بہت گھٹیا مخالفین سے واسطہ پڑا تھا۔ پادری اُس کے مخالف تھے اور اُنہوں نے اُس کے خلاف کئی ہتھکنڈے استعمال کیے۔ نہ صرف Crypto-Catholic بلکہ the pietists، The Quietists, the Lutheran Mystics مختصراً پروٹسٹنٹ چرچ کے تمام مافوق الفطرت فرقے، ایک دوسرے کے جتنے بھی مخالف تھے، استدال پسند Johann Heinrich Voss کی نفرت میں اکٹھے ہو گئے۔ جرمنی میں اُن لوگوں کو تعقُّل پسند کہتے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب کے مقابلے میں منطق کو رد نہیں کرنا چاہیے۔ یہ مافوق الفطرت نظریہ رکھنے والوں کے مکمل طور پر برعکس ہے۔ جو کافی حد تک مذہب میں تعقُّل کو قبول نہیں کرتے۔ آخرالذکر، بے چارے تعقُّل پسندوں کے خلاف اپنی نفرت میں، پاگل خانے میں بند اُن پاگلوں جیسے لگتے ہیں جو ایک دوسرے کے فریبِ تصور کو قبول نہ کرتے ہوئے کسی حد تک ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔ لیکن شدید نفرت میں اُس آدمی کے خلاف ہو جاتے ہیں جسے وہ مشترکہ دشمن سمجھتے ہوں، اور وہ دشمن وہ معالج ہے جو اُن کی عقل کو درست کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اپنے کیتھولک رجحانات کی وجہ سے رومانوی مکتب کو رائے عامہ میں بہت نقصان پہنچا۔ اُسی وقت اُسے اپنے معبد میں ایک شدید جھٹکا لگا، اور وہ ابھی اُن دیوتاؤں میں سے ایک کے ہاتھوں جسے خود انہوں نے وہاں تقدس سے رکھا ہوا تھا۔ کیوں کہ یہ ولف گیسنگ گوئٹے تھا جو شلیجل برادران کی تباہی کا امکان کرنے اپنی اونچی کرسی سے نیچے اُترا، اور یہ وہی بڑے پادری تھے جنہوں نے اُسے لوبان پیش کی تھی۔ اس آواز نے بھوتوں کے پورے ٹولے کو نابود کر دیا تھا، قرونِ وسطیٰ کا آسیب بھاگ گیا، اُلوغیر اہم قلعوں کے کھنڈرات میں واپس آ گئے، پہاڑی کوے اپنے پرانے گرجوں کی کلسوں کی طرف اُڑ گئے۔ فریڈرک شلیجل وی آنا چلا گیا جہاں وہ روز عبادت میں شامل ہوتا اور ابلا ہوا مرغ کھاتا، اے ڈبلیو شلیجل برہما کے پگوڈے کی خلوت میں چلا گیا۔

اگر بے تکلفی سے اعتراف کیا جائے، گوئٹے نے اُس وقت بہت ہی اہم کردار ادا کیا، اور اُس کی

غیر مشروط تعریف نہیں کی جاسکتی۔ یہ سچ ہے کہ شلیجل برادران اُس کے ساتھ مخلص نہیں تھے، اُنہوں نے غالباً اُس کے لیے قربان گاہ بنائی اور لوبان پیش کیا اور عوام الناس کو اس کے آگے جھکنا سکھایا، کیوں کہ پرانے مکتب کے خلاف اُنہیں کسی زندہ شاعر کو بطور ماڈل پیش کرنے کی ضرورت تھی، اور اس کام کے لیے اُنہیں گوئٹے سے زیادہ کوئی بھی موزوں نظر نہیں آیا، اور شائد اُنہیں اُس سے کچھ ادبی عنایات کی توقع تھی۔ اس کے علاوہ وہ اُن سے دور نہیں تھا Jena سے Weimar جانے والی سڑک آلوچے کے خوبصورت درختوں کے خیاباں میں سے گزرتی ہے اور یہ رسیلے پھل گرمیوں میں سفر کرنے والے کو بہت پسند ہیں۔ شلیجل برادران اکثر اس سڑک پر سفر کرتے تھے اور Weimar میں اُن کی گوئٹے سے کافی ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ہمیشہ ایک مکمل چالباز تھا۔ وہ شلیجل برادران کی باتیں غور سے سنتا اور موافقانہ انداز میں مسکراتا، اکثر کھانا کھلاتا اور مختلف عنایات سے نوازتا۔ انہوں نے Schiller سے بھی رابطہ کیا لیکن اولذکر ایک ایماندار صاف دل انسان تھا، اور اُسے ان دونوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ Schiller اور گوئٹے کے درمیان خط و کتابت، جو تین سال پہلے شائع ہوئی، ان دونوں شاعروں اور Schiller کے درمیان تعلقات پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ گوئٹے تکبر اور حقارت آمیزی سے اُن کا مذاق اُڑاتا ہے، Schiller اُن کی حقارت آمیز سکینڈل سازی شہرت کے شوق پر ناراض ہے، اور اُنہیں ''پہلے'' کہتا ہے۔

اگرچہ اُن کی طرف گوئٹے کا رویہ تحقیر آمیز تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنی شہرت کے لئے اُن کا مقروض تھا کیوں کہ اُنہوں نے ہی اُس کی تحریروں کو متعارف کر دیا اور اُن کے مطالعے کو آگے بڑھایا۔ جس تحقیر اور بے عزتی کے انداز سے اُس نے اُنہیں پرے کیا اُس میں ناشکرے پن کی مہک تھی۔ شاید گوئٹے اپنی غیر مبہم بصیرت کی بدولت شلیجل برادران کے ساتھ ناخوش تھا کہ وہ اُسے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ منصوبے غالباً اس کے پروٹسٹنٹ ریاست کے وزیر ہونے کی مصالحانہ حیثیت کے لیے دھمکی تھے۔ شاید کیتھولک خامیوں کا احمقانہ نظارا اُس کے اندر پرانے دیوتا سمان ملحد کو جگا دیتا تھا۔ کیوں کہ جیسے Voss قوی الجثہ کانے Odin سے مشابہہ تھا، اسی طرح گوئٹے شکل اور جسامت میں جیوپڑ سے ملتا تھا۔ اولذکر کو مجبور کیا گیا کہ وہ Thor کے ہتھوڑے کے ساتھ لمبے عرصے کے لیے زور سے ضربیں لگائے، آخرالذکر کو غصے سے اپنے شاہانہ سر کو خوشبودار لٹوں کے ساتھ ہلانے کی ضرورت تھی، اور شلیجل برادران کانپتے ہوئے نظر سے دور چلے گئے۔ روحانی مکتب کی مخالفت میں گوئٹے

کا عوامی بیان اُس کے رسالے Kunst und Alterthum میں Concerning the Christian Patriotic-New German School of Art کے عنوان سے چھپا۔ گوئٹے نے اس مضمون سے جرمن ادب میں اٹھارواں برومیئر بنایا کیوں کہ شلیجل برادران کو اتنی تیزی کے ساتھ عبادت گاہ سے نکال کر اور اُن کے متعدد پرجوش شاگردوں کو اپنے ساتھ ملا کر، اور عوام کی ستائش حاصل کر کے، جنہیں شلیجل برادران کی تحریریں بیہودہ لگتی تھیں، اُس نے جرمن ادب میں اپنی آمرانہ سلطنت قائم کر لی۔ اُس کے بعد شلیجل برادران کا ذکر تک نہیں سنا گیا۔ کبھی کبھار اُن کے نام سننے میں آجاتے جیسے اتفاقیہ Barras یا Gohier کے بارے میں بات ہوجاتی تھی۔ اس کے بعد نہ ہی رومانٹک شاعری اور نہ ہی کلاسک شاعری کا ذکر ہوتا، ہر طرف گوئٹے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس دوران میں کچھ اور شاعر بھی نظر پر آئے، جو اسلوب اور تخیل میں بہت کم گوئٹے سے کم تر تھے۔ لیکن تعظیماً اُنہوں نے اُسے اپنا سربراہ تسلیم کیا، اُنہوں نے اُسے خراج عقیدت پیش کیا، اُنہوں نے اُس کا ہاتھ چوما، اُنہوں نے اُس کے سامنے گھٹنے ٹیکے۔ Parnassus کے یہ منصب دار عوام الناس سے مختلف تھے۔ کیوں کہ اُنہیں گوئٹے کی موجودگی میں اپنی کامیابی کے گن گانے کی اجازت تھی۔ بعض اوقات وہ اسے تنقید کا نشانہ بھی بناتے لیکن جب اُن میں سے کوئی کم تر شاعر تنقید کی جرات کرتا تو وہ بُرا مناتے۔ قطع نظر اس کے کہ اشراف اپنی رعایا سے جتنے بھی ناراض ہوں، جب بھی عام لوگ بغاوت کی جسارت کریں، وہ ہمیشہ ناخوش ہوتے ہیں۔ اور حقیقتاً اگلے بیس برسوں سے تعقل کے اشراف کو گوئٹے سے برانگیختہ ہونے کی بہت اچھی وجوہات تھیں۔ جیسا کہ اُس وقت میں نے تلخی کے ساتھ کہا تھا ''گوئٹے تو فرانس کے لوئی ایاز دہم کی طرح کا تھا جو طاقت ور اشرافیہ کی تذلیل کرتا اور عام لوگوں کی وقعت بڑھاتا۔

وہ عمل قابل نفرت تھا۔ گوئٹے پر خود مختار اور اوریجنل لکھنے والے سے خائف تھا، لیکن تمام ادنیٰ مصنفین کی عزت اور تعریف کرتا۔ اس طریقۂ عمل کو گوئٹے نے اتنا بڑھا دیا کہ اس کی تعریف اوسط درجے کی سند سمجھی جانے لگی۔

میں بعد میں اُن شاعروں کا ذکر کروں گا جو گوئٹے کی شہنشاہیت میں پروان چڑھے۔ وہ نوجوان درختوں پر مشتمل ایک جنگل ہے، جس کی وسعت ایک صدی پرانے شاہ بلوط کے گرنے سے قابل ادراک ہوئی ہے جس کی شاخوں نے اُنہیں پیچھے موڑ دیا تھا اور اُن پر غلبہ پا لیا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے،

گوئٹے ،اُس بڑے شاہ بلوط کی تلخ اور پر جوش مخالفت میں کمی نہیں تھی۔اس مخالفت میں مختلف آرا اُٹھتی تھیں۔قدامت پسند ناراض تھے کہ اس عظیم درخت کے تنے میں بزرگوں کے چھوٹے پتوں کے لیے کوئی جھروکا نہیں رکھا گیا،لیکن اس کے برعکس کوہستان کی برہنہ بن دیویوں کو اس کے نیچے جادوٹونا کرنے کی اجازت تھی۔پادریوں بخوشی Saint Boniface کی نقالی کرتے ہوئے مقدس کلہاڑے سے اس جادو کے شاہ بلوط کو گرادیتے۔دوسری طرف ،آزاد خیال ناراض تھے کہ وہ اِسے آزادی کے درخت اور [رجعت پسندی کے خلاف] رکاوٹ کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔لیکن حقیقاً درخت اتنا بڑا تھا کہ اس کے اوپر سرخ ٹوپی نہیں رکھی جاسکتی تھی اور نہ ہی اس کے نیچے انقلاب فرانس کے دوران گایا گیا گیت دہرایا جا سکتا تھا۔لیکن عام لوگوں نے اسے اس لیے عزت بخشی کہ یہ شاہانہ اور خودمختار تھا، کیوں کہ یہ تمام دنیا کو اپنی پرلطف خوشبو سے معطر کر دیتا تھا، کیوں کہ اس کی شاخیں شان وشوکت سے جنت کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں، اس لیے تارے اس بڑے حیران کن درخت کے پھل لگتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ گوئٹے کے خلاف مخالفت کا آغاز نام نہاد مصنوعی Wanderjahre کی اشاعت کے بعد شروع ہوا، جسے Quedlinburg کے Gottfried Basse نے Wilhelm Meisters WandarJahre کے عنوان سے 1821 میں چھاپا،یعنی شلیجل برادران کے زوال کے جلد بعد۔گوئٹے نے اپنے Wilhelm Meisters Lehrjahre کو دوسری قسط میں جاری رکھنے کا فیصلہ کیا،اس عنوان کے تحت ،اور حیرانی کی بات ہے کہ یہ اپنے ادبی ہمزاد کے ساتھ بیک وقت منظر عام پر آیا اور اس میں نہ صرف گوئٹے کے اسلوب کی نقل کی گئی بلکہ گوئٹے کے اصل ناول کے ہیرو کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا گیا۔یہ مزاحیہ نقالی خاصے ٹیلنٹ کو ظاہر کرتی تھی اور اُس سے بھی زیادہ ہنر کو، کیوں کہ، جیسے مصنف نے ایک خاصی طویل مدت کے لیے اپنی شناخت ظاہر نہ ہونے دی،اپنی پہچان کے لیے ہونے والی تمام کوششوں کو روکتے ہوئے ،مصنوعی عوامی دلچسپی وجود میں آئی۔آخر کار آشکار ہوا کہ مصنف Pustkuchen نامی ایک غیر معروف دیہاتی پادری ہے، جس کا فرانسیسی ترجمہ Ommelette Soufflee یعنی نرم آملیت ہوگا۔یہ ایسا نام ہے جو کتاب کے جوہر کو بیان کرتا ہے۔یہ پرانی ،باسی ،کڑوں عجسین کی تحریک تقویٰ ہے،و جمالیات میں گندھی ہوئی۔اس کتاب میں گوئٹے پر الزام لگایا گیا تھا کہ اُس کی نظموں کا کوئی اخلاقی مقصد نہیں،اور وہ بڑے کردار تخلیق نہیں کرسکتا

بلکہ صرف کم تر اور بیہودہ مخلوق تخلیق کرتا ہے، کہ اس کے برعکس Schiller نے آئیڈیل سربلند نظریات تخلیق کیے ہیں، اس لیے آخرالذکر ایک عظیم شاعر ہے۔ Pustkuchen کی کتاب کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ Schiller گوئٹے سے عظیم تر شاعر تھا۔ دونوں زندہ شاعروں کا تقابلی جائزہ ایک رواج بن گیا اور عوام دو مخالف دھڑوں میں بٹ گئے۔ Schiller کے مداح سراؤں نے جوش وخوش سے اس کے ڈرامائی ہیروؤں Max Piccolomini, Thekla, Posa کی پاکیزگی اور عظمت کی تعریف کی، دوسری طرف اُنہوں نے گوئٹے کے Philine, Katchen, Clarchen اور اس طرح کے دوسرے ہیروؤں پر بداخلاق اور نکمے ہونے کا الزام لگایا۔ گوئٹے کے پیروکار بخوشی قبول کریں گے کہ نہ اُس کے ہیرو اور نہ ہیرونیں بااخلاق کہی جاسکتی ہیں، لیکن اُن کا دعویٰ تھا کہ اخلاق کا پرچار کسی بھی طرح سے فن کے حلقۂ اثر میں نہیں آتا۔ اُنہوں نے زور دیا کہ فن میں، کائنات کی طرح، کوئی دانستہ چھپایا ہوا مقصد نہیں، یہ صرف انسان ہی ہے جو مقاصد اور ذرائع کے نظریات کا تعارف کراتا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ کائنات کی طرح فن بھی صرف اپنے لیے زندہ ہے۔ اگرچہ کائنات کے متعلق انسانی آرا مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہیں، لیکن کائنات اُسی طرح رہتی ہے، اسی طرح فن بھی انسانیت کے عارضی نظریات سے بے اثر ہے۔ خصوصاً فن کو اخلاقی نظام سے الگ رکھا جائے، لیکن یہ روئے زمین پر نئے مذہب کے وجود میں آتے ہی تبدیل ہوجاتی ہیں اور پرانے مذہب کو غیر موثر بنادیتی ہیں۔ حقیقتاً جیسا کہ کچھ صدیوں کے گزرنے کے بعد ہمیشہ ایک نیا مذہب وجود پذیر ہوتا ہے، اور رسوم پر اثر انداز ہوتا، اور اس طرح اپنے آپ کو اخلاقیات کا ایک نیا نظام منواتا ہے، چناچہ ہر دور میں ماضی کے فن پاروں کو کافرانہ اور غیر اخلاقی گردانا جائے گا، اگر اُنہیں اخلاقیات کے عارضی معیار سے پرکھا جاتا۔ حقیقتاً ہم اُن اچھے عیسائیوں کو دیکھنے کے لیے زندہ رہے، جو جسم کو شیطانی جان کر اسے رد کرتے ہیں، یونانی اساطیر کے مجسموں کے نظر آنے پر غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ پاکیزہ پادریوں نے قرون اولیٰ کی وینس پر سفید اپرن ڈال دیا ہے، برہنہ اجسام کو انجیر کے پتے سے ڈھانپنے کا احمقانہ رواج آج کے دور تک جاری رہا۔ ایک پاکیزہ Quaker اپنی تمام دولت کو قربان کرکے Giulo Romano کی خوب صورت ترین اساطیری مصوری کو خریدنے کے بعد جلا دینے کی حد تک گیا، واقعتاً وہ جنت تک پہنچے کی تکلیف اُٹھانے اور وہاں روزانہ کوڑے کھانے کا مستحق ہے۔ ایک مذہب جو خدا کو صرف مادے میں شناخت کرے، اور جسم

کوصرف خدائی سمجھے، جب یہ خود کولوگوں کے رسم رواج پر منطبق کرے، ایک اخلاقی نظریے کو پروان چڑھائے، جس کے مطابق صرف وہی شاہکار قابل تعریف سمجھے جائیں جو جسم کواہمیت دیں، اور اُس کے برعکس، عیسایت کے وہ شاہکار جو جسم کی Nothingness کو بیان کریں غیر اخلاقی گردانے جائیں گے۔ جو شاہکار ایک ملک میں اخلاقی سمجھے گئے، وہ دوسرے ملک میں غیر اخلاقی جانے جائیں گے جہاں کسی اور مذہب نے مختلف رواجوں کو پروان چڑھایا ہے۔ چناں چہ ہمارے مصوری کے شاہکار مسلمان کے اندر نفرت کواُبھا ریں گے جب کہ وہ سب کچھ جومشرقی نصف کرہ میں کافی بے ضرر سمجھا جاتا ہے عیسائیوں کی نظر میں قابل نفرت ہوگا۔ ہندوستان میں رقاصہ کے پیشے کو اتنا قابل نفرت نہیں سمجھا جاتا، چناں چہ، ''وسنتاسینا'' کا ڈرامہ جس کی ہیروئن ڈیرے دار طوائف تھی، وہاں قطعاً اتنا غیر اخلاقی نہیں جانا جاتا۔ اگر TeaTre Fraueais اس ڈرامے کو پیش کرنے کا فیصلہ کرے ___ وہی تماشا گاہ جو شوق سے اُن ڈراموں کو دیکھتی ہے جن کی کہانیوں میں رنگیلی سازشیں ہوتی ہیں، اور جن کی ہیروئین نوعمر بیوائیں ہوتی ہیں جو ڈرامے کے اختتام پر شادی کر لیتی ہیں، بجائے اس کے کہ ہندو اخلاقیات کے تحت اپنے خاوند کی چتا پر جل مریں۔

اس تصور کو نکتۂ آغاز مانتے ہوئے، گوئٹے کے پیروکاروں نے فن کا جدا، خود مختار دنیا سمجھا جسے وہ اتنا بلند مقام عطا کرتے، کہ انسانیت کے تبدیل ہوتے، قابل تبدیل اعمال، مذاہب اور اخلاقیات کے نظام، اس کے بہت نیچے چلے جاتے۔ میں اس نظریے کی غیر مشروط تائید نہیں کر سکتا، لیکن گوئٹے کے پیروکار اس سے اتنے گمراہ ہو چکے تھے کہ اُنہوں نے فن کو اپنے اندر اور اپنے لیے اعلی ترین اچھائی سمجھا۔ چناں چہ اُنہیں حقیقت کی دنیا کے دعووں سے الگ رہنے کی ترغیب دی گئی، جو، بحر حال، زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

Schiller نے خود کو حقیقت کی دنیا کے ساتھ گوئٹے سے زیادہ قطعیت سے منسلک کیا، اور اس کے لیے وہ تعریف کا حق دار ہے۔ وقت کی زندہ روح فریڈرک شلر کے ذریعے حرکت پاتی تھی، یہ اس سے جدل کی حالت میں تھی، یہ اس پر حاوی ہوگئی، وہ اس کے پیچھے میدان جنگ میں گیا، اس کا علم اُٹھایا، اور لو! یہ وہی علم تھا جسے جیتنے کے لئے ہم اپنے دل کا خون بہانے کو تیار ہوتے ہیں۔ شلر نے انقلاب کے عظیم خیالات کے لیے لکھا، اس نے تعقل کے بُرج گرائے، اُس نے آزادی کی عبادت گاہ تعمیر کرنے

میں مدد کی، وہ بڑی عبادت گاہ جو تمام قوموں کو بھائیوں کے ایک اجتماع کی شکل میں تحفظ پہنچاتی ہے، مختصراً وہ ایک جگ دیسی فرد تھا۔ اُس نے اپنے کیریر کا آغاز اس ماضی سے نفرت کے ساتھ کیا جو ہم The Robbers میں دیکھتے ہیں۔ اس شاہکار میں وہ اُس چھوٹے سے بھوت سے مشابہہ ہے جو سکول سے بھاگنے کے بعد شراب سے مدہوش ہو کر جیو پڑ کی کھڑکیوں پر پتھر پھینکتا ہے۔ اُس نے اس کا مستقبل سے اُس محبت کے ساتھ اختتام کیا جو پہلے ہی اُس کے Don Carlos میں پھولوں کے قطعے کی طرح کھلا ہوا ہے۔ شلر خود ہی Marquis Posa ہے جو بیک وقت پیغمبر اور سپاہی ہے، اور اپنی پیشین گوئی کی حفاظت میں برسرِ پیکار ہے ہسپانوی چوغے کے نیچے وہ عظیم المرتبہ دل دھڑکتا ہے جو جرمنی کے لیے کبھی دھڑکا اور جس نے تکالیف اُٹھائیں۔

ایک چھوٹی سطح پر شاعر خالق کی نقالی ہے، اور اپنے جیسی مماثلت رکھنے والے کرداروں کو تخلیق کر کے خدا سے بھی مشابہہ ہے۔ چناں چہ اگر Carl Moor اور Marqius Posa مکمل طور پر شلر ہیں، تو اطوار میں گوئٹے اپنے ورتھر، ولہلم ماسٹر اور فاؤسٹ سے مشابہہ ہے، جن کے اندر اُس کے تعقل کی مختلف سطحیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جب کہ شلر خود کو نسل انسانی کی تاریخ کے لیے وقف کرتا ہے، اور انسان کی سماجی ترقی کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے، دوسری طرف گوئٹے خود کو فرد، قدرت اور فن کے مطالعہ کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ ضرورت کے تحت طبعیاتی سائنسز گوئٹے کے مطالعہ کا نمایاں پہلو بن جاتی ہیں، نظموں کے علاوہ اُس کی سائنسی تحقیق کے نتیجے میں حقیقتِ وحدت وجود۔ کسی حد تک اُس کی عینیت حقیقت وحدت وجودیت کے نظریات کی وجہ سے تھی۔ کاش! ہمیں اس اعتراف سے عار نہیں ہونا چاہیے کہ حقیقتِ وحدت وجودیت عموماً لوگوں کے لیے عینیت کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ وہ اس طرح دلیل دیتے ہیں، اگر خدا ہر چیز ہے، اگر ہر چیز مقدس ہے، اس سے واسطہ نہیں آدمی خود کو بادلوں سے معروف رکھے یا پرانے ہیروں سے، لوک گیتوں یا بن مانسوں کے علمِ تشریح الاعضا، سے، حقیقی انسانوں سے یا ڈرامے کے اداکاروں سے۔ بس یہی غلطی ہے۔ ہر چیز خدا نہیں ہے، لیکن خدا ہر چیز ہے۔ وہ تمام چیزوں میں اپنے آپ کو یکساں طور پر ظاہر نہیں کرتا، بلکہ خود کو اشیا میں مختلف تفصیلی درجوں سے ظاہر کرتا ہے۔ ہر چیز اپنے اندر اوپر کی سطح کی خدائی تک پہنچنے کا اضطرار رکھتی ہے، اور تمام قدرت کے اندر یہی بڑا قانون ارتقا ہے۔ اس قانون کی تفہیم، جسے سینٹ سائمن کے مریدوں نے بہت واضح طور پر عیاں کیا ہے، اب حقیقتِ

وحدت وجود کو کائناتی، آفاقی نظریہ بناتی ہے، جو نہ صرف عینیت کی طرف لے کر نہیں جاتی، بلکہ اس کے برعکس، ذاتی قربانی کی ترغیب دیتی ہے۔ نہیں، خدا تمام اشیا میں خود کو یکساں طور پر ظاہر نہیں کرتا جیسے کہ ولف گینگ گوئٹے کا یقین تھا، اور جو اس عقیدے کی وجہ سے عینیت پرست ہو گیا، اور خود انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے لیے وقف کرنے کے بجائے، اپنے آپ کو فن، علمِ تشریح الاعضا، رنگوں کے نظریوں، نباتیاتی مطالعات اور بادلوں کے مشاہدے میں معروف کر دیا۔ نہیں، خدا بعض چیزوں میں دوسری سے زیادہ آشکار ہے۔ وہ حرکت، عمل اور وقت میں موجود ہے۔ اس کا مقدس سانس تاریخ کے اوراق میں سے گذرتا ہے۔ جو خدا کے ریکارڈ کی صحیح کتاب ہے۔ فریڈرک شلر نے یہ محسوس کیا، اور تاریخ دان ہو گیا، ماضی کا ایک پیغمبر، اور اس نے 'Revolt of the Netherlands; Thirty Years War, The Maid of Orleans, William Tell جیسے شاہکار تخلیق کیے۔

یہ سچ ہے کہ گوئٹے نے بھی آزادی کی چند بڑی جدوجہدوں کو بیان کیا ہے، لیکن اُس نے اُنہیں بطور فن کار پیش کیا۔ اُس کے لیے عیسائی اشتیاق قابل نفرت تھا، اور ناراضی سے اُس نے اُس سے منہ موڑا، اور فلسفے کے لیے شوق، جو ہمارے دور کا خاصہ ہے، وہ یا تو اسے سمجھ نہ سکا اور یا ذہنی آسودگی کے منتشر ہونے کے خوف سے سمجھنے کی کوشش نہ کی،، چناں چہ اُس نے سارے اشتیاق کو معروضی اور تاریخی طور پر استعمال کیا، مفروضے کے طور پر ___ اُس کے ہاتھوں میں زندہ روح مردہ مادہ بن گیا، اور اس نے اسے خوبصورت اور خوشگوار شکل دی۔ وہ ہمارے ادب کا عظیم ترین فن کار بن گیا، اور جو کچھ اُس نے لکھا، فن کی تکمیل تھا۔

استاد کی مثال نے شاگردوں کو گمراہ کر دیا، اور جرمنی میں ایک ایسا ادبی دور وجود میں آیا جسے ایک دفعہ میں نے ''فن کا دور'' کہا تھا، اور جس نے، جیسے میں نے دکھایا، جرمنی کے لوگوں کی سیاسی ترقی پر تباہ کن اثرات ڈالے۔ ساتھ ہی ساتھ، میں کسی طرح بھی گوئٹے کے شاہکاروں کی باطنی اہمیت سے انکار نہیں کر رہا۔ وہ ہمارے پدروطن کو اس طرح سجاتے ہیں جس طرح خوبصورت مجسمے ایک باغ کی زینت بنتے ہیں، لیکن وہ آخر کار صرف مجسمے ہیں ___ بے شک کوئی اُن کی محبت میں گرفتار ہو جائے، لیکن وہ بانجھ ہیں۔ گوئٹے کی نظمیں، شلر کی نظموں کی طرح، کارہائے نمایاں کو جنم نہیں دیتیں۔ کارہائے نمایاں الفاظ کی پیداوار ہیں، لیکن گوئٹے کے الفاظ بچوں کے بغیر ہیں۔ ہر وہ چیز جو فقط فن سے نکلی ہے اُس کی لعنت

ہے۔Pygmalian نے جو مجسمہ بنایا وہ ایک خوبصورت عورت کا تھا، اور مجسمہ تراش کو بھی اُس سے محبت ہوگئی تھی۔اس کے بوسوں نے مجسمے کو زندگی کی مدت دے دی، لیکن اُس نے بچے پیدا نہیں کیے۔میرے خیال میں Charles Nodier نے بھی ایسے ہی تصور کی تجویز پیش کی ہے، اور یہ خیال میرے ذہن میں Louvre میں گھومتے ہوئے، اس وقت آیا جب میری نظر پرانے دیوتاؤں کے مجسموں پر پڑی۔وہ وہاں ایستادہ تھے، سفید، بے تاثر آنکھوں کے ساتھ، اُن کی پتھریلی مسکراہٹوں میں ایک پراسرار اداسی تھی۔شاید مصر کی غمگیں یادیں اُنہیں بار بار یاد آتیں، مُردوں کا وہ خطہ جہاں سے وہ آئے تھے۔یا پھر اُن کے لیے اُس زندگی تمنا تکلیف دہ تھی جس سے اُنہیں اُن کی ذات باری تعالیٰ نے نکال دیا، یا اپنی موت کے غیر فانی پن پر دکھ۔وہ اُس پیغام کے منتظر نظر آتے ہیں جو اُنہیں سرد، ساکن غیر لچک پن سے نکال کر زندگی میں واپس لے آئے گا۔تعجب ہے کہ یہ پرانے مجسمے مجھے گوئٹے کی تخلیقات کی یاد دلاتیں، جو اسی طرح اتنے مکمل، خوبصورت، اتنے ساکن ہیں، اور ایک خاموش پریشانی کے بوجھ تلے دبے نظر آتے ہیں کہ اُن کا غیر لچک دار پن اور سرد مہری اُنہیں ہماری موجودہ زندگی گرم جوشی والی اور بے قرار زندگی سے جدا کیے ہوئے ہے ___ کہ وہ ہمارے ساتھ گفتگو اور حظ نہیں اٹھا سکتے، اور وہ انسان نہیں ہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ اور پتھر کی ناخوش آمیزش ہیں۔

یہ چند اشارت جرمنی میں گوئٹے کے خلاف بعض لوگوں کی رائے کو ظاہر کرتے ہیں۔رجعت پسند اس بڑے کافر سے ناراض تھے، جیسا کہ جرمنی میں اُسے عمومی طور پر کہا جاتا تھا۔وہ لوگوں پر اس کے اثر سے خائف تھے، جنہیں اُس نے دنیا کو پر لطف نظموں کے ذریعے اور سادہ اور سطحی قصوں کے ذریعے بھی دیکھنے کا سبق دیا۔گوئٹے اُنہیں صلیب کا سب سے بڑا دشمن نظر آیا، جو، اُس کے اپنے مطابق، اُس کے لیے اُتنا ہی قابل نفرت تھا جتنا کہ کوئی کیڑا لہسن، اور تمباکو۔کم از کم یہ Xenie کا یہی مقصد ہے جسے گوئٹے نے جرمنی میں چھاپنے کی جرات کی ___ اُس ملک میں جہاں کیڑا لہسن، تمباکو اور صلیب ایک مقدس اتحاد ہیں، اور ہر شے پر بالادست ہیں۔لیکن ہم جو عمل پر یقین رکھتے ہیں، اس امر سے ناخوش نہیں۔جیسا پہلے کہا جا چکا ہے، ہم نے گوئٹے کی تحریروں بانجھ پن کے نقائص ڈھونڈے، فن کے لیے جاذب توجہ وفاداری، جو اُس کے ذریعے جرمنی میں پھیلائی گئی، کیوں کہ جرمن نوجوانوں میں بے حسی کا جذبہ پیدا کرنا پدروطن کی سیاسی تجدید کے لیے ایک رکاوٹ ہے۔چناں چہ وحدت وجود پسند اور مذہبی

معاملات میں لاتعلق شخص پر مختلف اعراف سے ہلہ بولا گیا۔فرانسیسی پارلیمانی زندگی سے ایک مثال دی جا سکتی ہے: دائیں بازو اور بائیں کے انتہا پسندوں نے اُس کے خلاف ایک اتحاد بنالیا، جبکہ جبہ پوش پادری اُس کے اوپر صلیب لہرا رہے تھے، اسی وقت غضبناک انتہا پسند انقلابی نے اُس پر برچھیوں سے حملہ کر دیا۔

ولف گینگ مینزل، جس نے گوئٹے کے خلاف تحریک چلائی، چاہئے تو یہ تھا کہ اس ٹیلنٹ کا بہتر مقصد ہوتا، اُس نے اپنے مذہبی مباحث پر کہا کہ گوئٹے صرف یک طرفہ روحانیت کا قائل عیسائی نہیں تھا، نہ ہی ایک مایوس محبِّ وطن تھا، بلکہ اُس نے اپنی تنقید کا کچھ حصہ فریڈرک شلیجل کی تازہ ترین رائے پر مبنی کرتے ہوئے، جس نے کیتھولک کلیسا سے اپنے زوال کے بعد، گوئٹے سے متعلق اپنے غم والم کا اظہار کیا، گوئٹے کے متعلق کہا کہ ''اس کی شاعری مرکزی نکتے سے عاری تھی''۔مینزل اس سے بھی آگے گیا، اور دکھایا کہ گوئٹے ایک جوہر قابل نہیں تھا، بلکہ ٹیلنٹ والا آدمی تھا تاہم شلر جوہر قابل تھا وغیرہ، وغیرہ۔ یہ جولائی کے انقلاب سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، مینزل اُس وقت قرون وسطیٰ، قرون وسطیٰ کے فنون اور اداروں کا بہت معترف تھا، وہ مسلسل Voss کو تنقید کا نشانہ بناتا، اور Jaseph Gorres کی ایسی تعریف کرتا جس کی مثال نہ تھی۔ یہ حقائق ثابت کرتے ہیں کہ مینزل، گوئٹے کے خلاف اپنی نفرت میں مخلص تھا، اور اُس نے گوئٹے کے خلاف صرف مشہور ہونے کے لیے نہیں لکھا، جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال تھا۔اگرچہ میں بھی اُس وقت گوئٹے کے مخالفین میں سے تھا، پھر بھی مینزل کی تنقید کا شدید لب ولہجہ پسند نہ آیا، اور میں نے اس گھٹیا پن کی شکایت کی۔میں نے کہا کہ گوئٹے بحرحال ہمارے ادب کا سالار ہے، ایسی شخصیت پر تنقید کی چھری چلاتے ہوئے، ہمیشہ مناسب ہوتا ہے کہ جائز عزت واحترام کا مظاہرہ کیا جائے، بالکل اُس جلاد کی طرح جس نے چارلس اول کا سر قلم کرنے کے سرکاری فرض سے عہدہ براہونے سے پہلے بادشاہ کے آگے گھٹنے ٹیکے اور اُس سے معافی کا خواستگار ہوا۔

گوئٹے کے مخالفین میں معروف شخصیت Hofrath Mullmer اور اُس کا واحد زندہ دوست پروفیسر شٹز تھا۔کچھ اور بھی تھے جو اتنے معروف نہیں ___ مثال کے طور پر Her Spann، جسے سیاسی جرم کی بدولت طویل المعیاد سزا ہوئی ___ وہ گوئٹے کے عوامی مخالفین میں سے تھا۔معزز قاری، آپس کی بات ہے، یہ ایک ہمہ انگ مجمع تھا۔میں نے ظاہری وجوہات تفصیل سے بتادی ہیں، لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اُن میں سے ہر ایک نے کس مقصد کے حصول کے لیے اپنے گوئٹے مخالف جذبات کا اظہار

کیا۔ مجھے اُن میں سے صرف ایک آدمی کے خفیہ مقاصد کا علم ہے، اور وہ میں ہوں۔ میں فراخدلی سے اعتراف کروں گا کہ مجھے گوئٹے سے حسد تھا۔ اپنے لیے اتنا کہوں گا کہ میں نے گوئٹے کے اندر کے آدمی پر ہلہ بولا تھا، شاعر پر کبھی بھی نہیں۔ اُن نقادوں کے برعکس جو اپنی عینکوں کے چمکتے شیشوں سے چاند پر دھبے دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، میں گوئٹے کے کام میں کبھی خامیاں تلاش نہیں کر سکا۔ یہ تیز نظر رکھنے جن کو دھبے کہتے ہیں وہ دراصل پھول دار جنگل، چاندی سی چمکتی ندیاں، لانچے پہاڑ اور مسکراتی وادیاں ہیں۔

اس سے زیادہ کوئی احمقانہ بات نہیں کہ شلر کے رتبے کو بڑھا کر گوئٹے کی تحقیر کی جائے، اور یہ رواج بن چکا تھا کہ اُس کی تعریف کر کے گوئٹے کے رتبے کو گھٹایا جائے۔ کیا ایسے ناقدین اس حقیقت سے واقف ہیں کہ وہ انتہائی بلند رتبہ، انتہائی مثالی اشکال، وہ پاکبازی اور اخلاقیات کی مقدس تصویریں جو شلر نے تخلیق کیں، اُنہیں اُن نازک، دنیاوی ہستیوں، جن کی گوئٹے ہمیں اپنے فن پاروں میں جھلک دکھاتا ہے، تخلیق کرنا بہت ہی آسان تھا؟ وہ نہیں جانتے کہ اوسط درجے کے مصور عموماً متبرک مضامین کا چناؤ کرتے ہیں، جن کی وہ کینوس پر رنگ آمیزی کر دیتے ہیں؟ لیکن زندگی سے جڑی حقیقت اور تکنیکی تکمیل سے ایک ہسپانوی خیرات مانگنے والے کھجاتے ہوئے لڑکے کی تصویر بنانے کے لیے ایک اُستاد کی ضرورت ہے، یا ایک گنوار کسان دانت نکلواتے ہوئے، یا کوئی بدصورت بوڑھی عورت جس کی تصویریں ہم ہالینڈ میں الماریوں میں لگی دیکھتے ہیں۔ فن میں بڑے المیہ مضامین کے مقابلے میں چھوٹے اور مضحکہ خیز تصویریں بنانا مشکل ہے۔ مصری جادوگر اپنے المیہ کرتبوں میں حضرت موسیٰ نقل اُتار سکتا تھا: وہ دیو (یا شیطان) بنا سکتے تھے، اور خون، اور مینڈک، لیکن جب حضرت موسیٰ نے حشرات تخلیق کیے، جن کی نقل کرنا بظاہر مشکل نظر نہیں آتا، اور پھر اُنہوں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا اور کہا ''یہ خدا کی انگلیاں ہیں۔'' فاؤسٹ کے بعض حصوں کے کھردرے پن کو ہم جتنا بھی ناپسند کریں، Brocken اور Auerbach کی کوٹھری کے مناظر پر، Wilhelm میں اخلاقی یا ختگی پر لعن طعن کریں، تاہم یہ اُس سے زیادہ ہے جو آپ کر سکتے ہیں، یہ گوئٹے کی انگلیاں ہیں! لیکن میں آپ کو مایوسی سے بات کرتے سن سکتا ہوں ''ہم ایسی چیزوں کے تخلیق کرنے کے خواہش مند نہیں، ہم جادوگر ہیں، ہم اچھے عیسائی ہیں'' میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ جادوگر نہیں۔

گوئٹے کی خوبی اُس کے کام کے کمال میں ہے، یہاں کچھ حصے اچھے اور کچھ بڑے نہیں ہیں، یہاں

کسی حصے کی باریک تفصیل سے تصویر کشی نہیں کی گئی جب کہ دوسرے کا صرف خاکہ ہو، اُس کے ہاں انتشار نہیں، نہ ہی روایتی فالتو مواد، نہ ہی بعض مخصوص کرداروں کے لیے مخصوص جانبداری۔ گوئٹے ہر کردار کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ وہ ہی اُس رومانس یا ڈرامے کی / کا مرکزی کردار ہے۔ ہومر اور شیکسپیئر کے ہاں بھی ایسا ہے۔ تمام بڑے شاعروں کے ہاں چھوٹے کردار بالکل نہیں ہیں، اپنی جگہ ہر کردار اہم ہے۔ ایسے شاعر مکمل شہنشاہ ہیں، روس کے بادشاہ پال کی طرح، جس نے ایک دفعہ فرانسیسی سفیر کو، جس نے کہا کہ اُس کے ملک کا ایک اہم آدمی ایک خاص معاملے میں دلچسپی رکھتا ہے، یہ جواب دیا، ''میری مملکت میں سوائے اُس آدمی کے جس کے ساتھ میں بات کر رہا ہوں، کوئی بھی اہم نہیں ہے، اور وہ اُس وقت تک اہم ہے جب تک میں اُس سے مخاطب ہوں۔'' ایک مکمل شاعر، خدا کی مہربانی سے جس کے پاس طاقت بھی ہے، ایسے حالات میں اُس آدمی کو اچھی نظر سے دیکھتا ہے جو اُس کی تعقلی سلطنت میں سب سے اہم ہے، جو اُس مخصوص وقت پر اُس کے قلم کی زبان بولتا ہے۔ فن کی اس شہنشاہی سے اُن بہت چھوٹے اور غیر اہم ہستیوں کی وہ حیرت انگیز تکمیل سر اُٹھائی ہے جو ہم ہومر، شیکسپیئر اور گوئٹے کے کاموں میں دیکھتے ہیں۔

اگر میں نے گوئٹے کے مخالفین کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، تو میرے پاس اُس کے حمایتوں کی کڑی تنقید کا جواز بھی ہونا چاہیے، اپنی الوالعزمی میں آخر الذکر کی اکثریت اس سے بھی بڑی غلطیوں کی مجرم ہے۔ جن لوگوں نے خود کو اس سلسلے میں مضحکہ خیز بنایا، اُن میں سر فہرست ایک Eckerman نامی آدمی ہے، ایک مصنف جو عمومی طور پر ٹیلنٹ میں کم نہیں تھا۔ Pustkuchen کے خلاف مہم میں Carl Immermann، جو اب ہمارا سب سے بڑا ڈرامیٹک شاعر ہے، اس نے ایک عمدہ ''کتابچہ'' چھاپ کر اپنے بطور نقاد ہونے کے شہرت حاصل کی۔ برلن نے خصوصاً اپنے آپ کو اس موقع پر منفرد رکھا۔ Varnhagen von Ense ہر وقت گوئٹے کا سر بر آوردہ حمائتی کار تھا، ایسا آدمی جس کا دل کائنات جتنے بڑے خیالات سے بھرا تھا، جو انہیں ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جو تراشیدہ ہیروں کی طرح قیمتی اور نفیس ہیں۔ یہ وہ بڑے دل والا آدمی ہے جس کی بصیرت پر گوئٹے کو بہت اعتماد تھا۔ شاید یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ Wilhem von Humboldt نے ایک دفعہ گوئٹے کے متعلق ایک عمدہ کتاب لکھی تھی۔ پچھلے دس برسوں میں Leipsic Fair گوئٹے

کے کئی کام سامنے لایا ہے۔ HerrSchubart کے گوئٹے کے مطالعات تنقید کے اعلیٰ نمونوں میں شامل ہیں۔ Herr Haring جس کا قلمی نام Willibald Alexis ہے اُس نے متعدد جریدوں میں گوئٹے پر دانش مندانہ اور قابل قدر مضامین لکھے۔ Herr Zimmermann، جو ہیمبرگ یونیورسٹی میں پروفیسر ہے، نے اپنے زبانی لیکچروں میں گوئٹے پر عمدہ تنقید کی ہے۔ ڈرامہ نگاری میں اُس کے مضامین میں ایسے ہی خیالات ملتے ہیں، جنہیں کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے، لیکن، وہ بہت واضح ہیں۔ جرمنی کی متعدد یونیورسٹیوں میں گوئٹے پر لیکچروں کے کورس تھے، اور اس کے سارے کام میں سے لوگوں نے خود کو خاص طور پر گوئٹے کے فاؤسٹ کے مطالعہ کے لیے وقف کیا۔ یہ نہ ختم ہونے والے مباحث اور آرا کا موضوع تھا، اور فاؤسٹ جرمنی کا سیکولر بائیبل بن گیا۔

میں سچا جرمن نہیں ہوں گا اگر میں فاؤسٹ کے متعلق کچھ وضاحتی خیالات کا اظہار نہ کروں، عظیم ترین مفکر سے غیر اہم کرائے کے لکھاریوں تک، فلسفیوں سے لے کر فلسفے کے پروفیسروں تک، ہر کوئی اس کتاب پر اپنی عقل استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ حقیقتاً اپنے دائرہ کار میں اتنی وسیع ہے جتنی بائیبل، آخر الذکر کی طرح، یہ جنت اور زمین، انسانیت اور انسانیت کی تشریح کرتی ہے۔ فاؤسٹ کا مواد اس کی شہرت کا سبب بنا۔ متعدد لوک روایتوں میں سے اس کا انتخاب گوئٹے کی قوت اور دانش کا ثبوت، وہی کچھ گرفت میں لیا جو نزدیک ترین اور سب اچھا تھا۔ میں یہ فرض کر سکتا ہوں کہ میرے قاری فاؤسٹ کی کہانی سے واقف ہیں، کیوں کہ فرانس میں کتاب بہت شہرت حاصل کر گئی، لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ یہاں اصل قصے کو بھی جانا جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کے سالانہ دیہاتی میلوں میں سلیٹی رنگ، پشمی کاغذ، ناقص چھپائی اور چوبی نقوش والی ایک چھوٹی سی کتاب، جو جبری فروخت کے لیے رکھی گئی ہے، اور جس میں ایک مکار جادوگر کا ضمنی ذکر ہے، Johann Faustus، ایک مستند عالم جس نے تمام سائنس علوم پڑھے ہوئے تھے، اُس نے آخر کار اپنی کتابیں پھینک دیں اور شیطان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا، جس کی وجہ سے وہ اس قابل بنا دیا گیا کہ تمام زمینی مادی خوشیوں سے لطف اُٹھا سکے، جس کے بدلے میں اُس کی روح کو دوزخ کی طاقتوں کے حوالے کرنا تھا۔ قرون وسطیٰ کے لوگوں نے تمام تر غیر معمولی تعقلی استطاعت کو شیطان کے ساتھ معاہدے سے منسوب کیا، اور Albertus Magnus, Raimond Lallus, Theophrastus Paracelsus, Agrippa von Nettesheim

اور انگلستان میں راجر بیکن، جادوگر، شعبدہ باز اور عامل گردانے گئے۔لیکن قصوں اور بولیاں ڈاکٹر فاؤسٹ کے متعلق بہت عجیب غریب کہانیاں سناتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ اُس نے شیطان سے نہ صرف فطرت کے راز جاننا چاہیے، بلکہ حقیقتاً جسمانی لطف بھی۔ یہ وہی فاؤسٹ ہے جس نے چھاپہ ایجاد کیا، اور اُس کے وقت میں لوگوں نے چرچ کی بالا دستی کو برا بھلا کہنا اور خود مختار تحقیق کرنا شروع کر دیا، اور فاؤسٹ کے آتے ہی قرون وسطیٰ کے دور ایمانی کا اختتام، اور موجودہ دور کی تنقیدی، سائنس کا آغاز ہوا۔حقیقتاً ایک مقبول روایت کے مطابق، فاؤسٹ Reformation اجتہاد کے آغاز میں زندہ تھا، اور اُس نے خود چھاپے کو ایجاد کیا، ایسا فن جس نے مذہب کو مات دی، ایک ایسا فن، اگر چہ، جس نے ہمیں کیتھولک ذہنی سکون سے محروم کر دیا، اور ہمیں شکوک اور اندھیروں کی طرف دھکیل دیا، اور آخر کار ہمیں شیطان کی طاقت کے زیر اثر کر دیا۔لیکن نہیں، علم، سائنس، دلیل کے ذریعے فطرت کا ادراک، آخر کار ہمیں جس مذہب سے لطف اندوز کراتا ہے جس کے بارے میں کیتھولک عیسایت نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ہم اب اس حقیقت کو شناخت کرتے ہیں کہ انسانیت کا مقدر زمینی اور ساتھ ہی جنتی برابری سے جڑا ہے۔فلسفہ جس سیاسی بھائی چارے کو ذہن نشین کراتا ہے وہ روحانی بھائی چارے سے سودمند ہے، اور جس کے لیے ہم عیسایت کے شکر گزار ہیں۔خیال الفاظ میں ڈھل جاتا ہے، الفاظ اعمال بن جاتے ہیں، اور پھر ہم اپنی زندگی میں اس زمین پر خوش ہوتے ہیں۔مزید برآں، ہم مرنے کے بعد وہ جنتی سکھ چین حاصل کرتے ہیں جس کا عیسایت اس یقین کے ساتھ وعدہ کرتی ہے! چلیں یہ اور بھی اچھی بات ہے۔

جرمن لوگ ایک عرصے سے یہ پیش بینی کر رہے تھے، کیوں کہ جرمن بذات خود عالم ڈاکٹر فاؤسٹ ہیں، وہ بذات خود روحانیت کے قائل میں جنہوں نے آخر کار روحانی زندگی کی کمیوں کو سمجھا، اور جسم کا اصل مقام بحال کیا، لیکن عیسائی شاعری کی علامتوں سے روا داری برتتے ہوئے، جس میں خدا کو روح کا نمائندہ دکھایا گیا ہے، اور شیطان کو جسم کا، جسم کی بحالی خدا سے انحراف اور شیطان کے ساتھ ایک معاہدہ بیان کیا گیا۔

جہاں تک جرمن لوگوں کا تعلق ہے کچھ وقت ضرور گزرنا چاہیے، پیشتر اس کے کہ جرمن لوگوں کے بارے اُس نظم کی بہت اہم پیش گوئی پوری ہو، اور روح بذات خود، روحانیت کی دست درازی کو سمجھتے

ہوئے، جسم کے حقوق کی چیمپئین بن جائے۔ یہ وہ انقلاب ہوگا، اجتہاد کی عظیم پیداوار۔

فرانس میں گوئٹے کے فاؤسٹ سے West-Ostlichen Divan کم مقبول ہے، یہ ایک بعد کا کام جس کا Madame de stael کو علم نہیں تھا، اور جو خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ یہ مشرقی نصف کرہ کے مخصوص خیالات اور محسوسات کو پر کشش قصوں (Ballads) اور پر معنی ضرب الامثال سے ظاہر کرتا ہے، جو معطر اور جذباتی ماحول کو جنم دیتا ہے، محبت کی بھوکی کسی حرم کی داشتہ کی طرح، جن کی آنکھیں غزالوں کی طرح کالی اور باز و مخصوص کشش لیے ہیں۔ قاری کپکپی اور خواہش کی ملی جلی سنسنی سے بھر جاتا ہے، خوش قسمت کا سپر وڈ بیر کاؤ کی طرح، جب وہ قسطنطنیہ میں سیڑھی کے اوپر والے سرے پر کھڑا تھا، اور پر شکوہ انداز میں دیکھ رہا تھا، ایسے انداز میں جس میں صرف وفاداروں کا کماندار ہی دیکھنے کا عادی ہے۔ بعض اوقات قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایرانی قالین پر آرام سے لیٹا، ایک لمبا ترکی پائپ پی رہا ہے جس میں ترکستان کا پیلا تمباکو بھرا ہے، جب کہ ایک جشن باندی اُسے رنگ برنگے مور کے پروں والے پنکھے سے ہوا دے رہی ہے، اور ایک خوبصورت لڑکا موچا کافی کا پیالہ دے رہا ہے ___ گوئٹے نے ان اشعار میں زندگی کے شیریں ترین اور مفرح محسوسات کو پیش کیا ہے ___ اشعار جو اتنے نازک، پر معنی، قیاسی اور ملکوتی ہیں کہ انسان حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ کیا جرمن زبان میں ایسا ممکن ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں مشرقی نصف کرہ کی رسوم اور اطوار کا نثری بیان اور توضیحات اور عربوں کی رئیسانہ زندگی شامل ہیں۔ مزید برآں گوئٹے بچے کی طرح پر سکون، خوش وخرم اور بے ضرر ہے، اور پھر بھی سفید داڑھی والوں کی طرح دانش ور۔ اس کام میں گوئٹے کی نثر اتنی شفاف ہے جتنا سبز سمندر، ایک روشن خاموش گرمیوں کی شام کو، جب ہم اُس کی گہرائی تک جائیں، اور پرانے ڈوبے ہوئے شہروں، اور حیرت انگیز تابنا کی تک ہماری نظر جائے۔ پھر بعض اوقات، یہ نثر اتنی جادوئی اور پر اسرار ہوتی ہے جتنا گنبدِ افلاک، جب شام کا دھندلکا چھٹ جائے اور عظیم گوئٹین خیالات اُبھریں، پاک اور سنہری، بالکل ستاروں کی طرح ___ اس کتاب کا فسوں نا قابل بیان ہے، یہ مغرب نے مشرق کو پیغام بھیجا ہے، اور یہاں بے شمار غیر معمولی اور انوکھے پھول جمع ہیں، جذبہ شوق سے سرشار سرخ پھول، کنواری کی چھاتیوں کی طرح سفید برف کے قطرے، مزاحیہ گل قاصدی، لمبی انسانی انگلیوں کی طرح ارغوانی ڈیجیلیٹس، زرد زعفران اور چوری چھپے جرمن بنفشے کے پھولوں کے درمیان میں سے باہر جھانکتے ہوئے۔ اس سلام

کا مطلب ہے کہ مغرب جو اپنی بے احساسی، کمزور روحانیت سے تنگ آ چکا ہے، اپنے آپ کو مشرق کی صحت مند اندوزیوں کے بیچ تازہ دم کرنا چاہتا ہے۔ فاؤسٹ میں گوئٹے تجریدی روحانیت کے متعلق اپنی نفرت کے اظہار کے بعد، اور اُس کی حقیقی لطف اندوزیوں کی خواہش میں West-Ostlichen Divan لکھ کر، اپنی سوچ کی تمام تر شدت کے ساتھ اُس نے خود کو جنسیت کی بانہوں میں ڈال دیا۔

اگر چہ یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ یہ کام فاؤسٹ کے جلد بعد منظر عام پر آیا۔ یہ گوئٹے کے جنیئس کا آخری مرحلہ تھا، اور ادب پر اُسی کی مثال کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اب مشرق ہمارے غنائیہ شاعروں کا موضوع تھا۔ یہ ذکر ضروری ہے کہ گوئٹے نے جہاں ایران اور عرب کا اپنے اشعار میں والہانہ انداز میں بیان کیا، وہاں وہ ہندوستان کا شدید نفرت سے ذکر کرتا ہے۔ اُس ملک کی عجیب وغریب اور درہم برہم خصوصیات اُسے قابل مقبول نہیں تھیں، اور شاید اس ناپسندیدگی کا ماخذ وہ شک ہے کہ کوئی کیتھولک حکمت عملی شلیجل اور اُس کے رفقا کے سنسکرت کے مطالعے کی تہہ میں ہے۔ یہ لوگ ہندوستان کو کیتھولزم کا گہوارہ تصور کرتے تھے، اُن کا دعویٰ تھا کہ اُنہوں نے وہاں کیتھولک نظامِ مراتب کا ماڈل، تثلیث کے نظریہ، تجسیم، نفس کشی، کفارے، جسم کے گداز، وغیرہ کے نظریے اور تمام من پسند پھول بوٹے دریافت کیے۔ گوئٹے کی ہندوستان کے خلاف اس نفرت نے ان لوگوں کو کوئی کم اشتعال نہ دلایا، اور اے۔ ڈبلیو شلیجل نے واضح طور پر اُس کے متعلق کہا ''ایک کافر جس نے اسلام قبول کیا۔''

گوئٹے کے متعلق اس سال منظر عام پر آنے والی تحریروں میں Johannes Falk کی بعد از مرگ کتاب ہے، جس کا عنوان Goethe aus personlichen umgange ہے۔ فاؤسٹ پر تفصیلی مقالے کے قطع نظر، جسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کتاب کے مصنف نے ہمیں گوئٹے پر متعدد عمدہ خاکے پڑھنے کو دیے ہیں، جن میں اُس نے اُسے زندگی کے تمام شعبوں سے وابستہ دکھایا ہے، بے تکلفانہ طریقے سے، اُس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ۔ اس کتاب میں ہم گوئٹے کے اپنی ماں کے ساتھ تعلقات دیکھتے ہیں، جس کا مزاج اپنے بیٹے میں عمدگی سے دکھایا گیا، اُسے ہم بطور فطرت پرست دیکھتے ہیں، جو ایک لاروے کو تتلی بنتے دیکھ رہا ہے، ہم عظیم Herder کو اُس عینیت کے خلاف تکرار کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جس نے گوئٹے کو انسانی ارتقا کو لاتعلقی سے اپنے سے گزرتے دیکھا، ہم اُسے عظیم ڈیوک ویمر کے دربار میں دیکھتے ہیں، بھورے بالوں والی درباری عورتوں کے درمیان بیٹھے،

برجستگی سے دل لگی کرتے ہوئے، اپالو کی طرح King Admetus کے ریوڑوں کی حفاظت کرتے، ہم اُسے پھر دلائی لاما کے گھمنڈ کے ساتھ دیکھتے ہیں، Kotzebue کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے، پھر ہم آخرالذکر کو شلر کی شان میں عوامی تقریب مناتے دیکھتے ہیں، گوئٹے کے رتبے کو کم کرنے کے لیے، ہم اُسے تمام چیزوں میں دیکھتے ہیں، عقل مند، خوش شکل، ہر دل عزیز ایک خوش بخت اور تحریک دینے والی ہستی، لازوال دیوتاؤں کی طرح۔

درحقیقت، جینیئس کی ظاہری حلیے کے ساتھ مطابقت، جس کے ہم عظیم لوگوں میں متقاضی ہیں، گوئٹے میں مکمل طور پر موجود ہے۔ اُس کا حلیہ اتنا ہی متاثر کن تھا جتنی اُس کی تحریریں۔ اُس کا جسم تناسب اور باوقار تھا، اور اُس پر شکوہ صورت میں یونانی فن ایک پرانے مجسمے کی شکل میں پڑھا جاسکتا ہے۔ وہ پروقار جسم، عیسایت کی حلمی سے کبھی جھکا نہیں، اُس پروقار چہرے کے نقوش عیسایت کی خود احتسابی سے کبھی مسخ نہیں ہوئے، وہ آنکھیں عیسایت کی ندامتِ نفس سے کبھی نہ جھکیں، نہ ہی کبھی اس نے پرہیزگاری اور کانپتے ہوئے جنت کی طرف دیکھا۔ نہیں، اُس کی آنکھوں میں دیوتاؤں سی ثابت قدمی تھی، کیوں کہ یہ ایک دیوتا کا امتیازی نشان ہے، کہ اُس کی نظریں پر جلال ہیں۔ چناں چہ جب اگنی، وارونا، یاما اور اندرا دامینتی کی شادی میں نالا Nala کا روپ دھارتے ہیں، آخرالذکر اپنے عاشق کو اُس کی آنکھوں کی جنبش سے پہچان لیتا ہے، کیوں کہ، جیسے میں نے کہا کہ دیوتا کی آنکھوں میں ہمیں ثابت قدمی اور مستقل مزاجی ملتی ہے۔

نپولین کی آنکھوں میں یہ خصوصیت تھی، چناں چہ، میں قائل ہوں کہ وہ بھی ایک دیوتا تھا۔ گوئٹے کی آنکھیں اس بوڑھی عمر بھی اُسی طرح دیوتاؤں جیسی رہیں جیسے کہ جوانی میں تھیں، اور اگرچہ وقت نے سر کے بال سفید کردیے تھے لیکن اُس معزز سر کو جھکا نہ سکا۔ اُس نے اپنے انداز میں ہمیشہ غرور اور شاہانہ ٹھاٹھ رکھی۔ جب وہ بات کرتا تھا تو اور شاہانہ ہوجاتا تھا، اور جب وہ ہاتھ بڑھاتا تو محسوس ہوتا کہ وہ ستاروں کی گردش کا راستہ متعین کررہا ہے۔ یہ کہا جاتا کہ ایک سرد، انانیت کی اضطراری جنبش اس کے ہونٹوں کے گرد محسوس کی جاسکتی تھی۔ یہ ازلی دیوتاؤں کا خاصہ بھی ہے، اور خاص کر دیوتاؤں کے باپ، عظیم جیوپڑکا، جس کے ساتھ میں نے پہلے ہی گوئٹے کو ملایا ہے۔ جب میں ویمر میں اُسے اس سے ملنے گیا تو میں نے غیر ارادی طور پر اردگرد دیکھا کہ شاید اُس کے کسی پہلو میں اپنی چونچ میں بجلی کا کوندا اُٹھائے کوئی شاہین نظر

آجائے۔ میں اُس سے یونانی میں بات کرنے ہی والا تھا کہ یاد آیا کہ وہ جرمن سمجھتا ہے، میں نے اُسے آخرالذکر زبان میں بتایا کہ جینا کے شہر سے ویمر کے راستے کے آلوچے بہت اچھے ہیں۔ سرما کی کئی لمبی راتیں میں ان باوقار اور واضح آرا کے بارے سوچتا رہتا جو میں گوئٹے سے کہوں گا، اگر میری اُس سے کبھی ملاقات ہوئی۔ اب جب کہ اُس سے بالمشافہ ملاقات ہوئی، میں نے اُسے بتایا کہ سیکسونی شہر کے آلوچے بہت ہی میٹھے ہیں۔ اور گوئٹے مسکرایا۔ وہ اُنہی ہونٹوں سے مسکرایا جن سے اُس نے کبھی خوبصورت لیڈا، یوروپا، ڈانائے، سیملی اور بے شمار شہزادیوں اور حسیناؤں کو چوما تھا۔

افسوس، گوئٹے فوت ہوگیا ہے۔ وہ پچھلے برس 22 مارچ کو فوت ہوا، یہ وہ یادگار سال جب دنیا سب سے مشہور ہستیوں سے محروم ہوئی۔ اچانک ایسے لگا کہ موت اشرافیہ ہوگئی ہے، اور موت نے ایک ہی وقت میں خصوصاً تمام بڑے لوگوں کو قبر میں بھیجنے کا سوچا۔ موت نے پرلوک میں شاید ایک Praire کی بنیاد رکھنی چاہی، جس کے لیے fournee کا انتخاب یا بکل درست تھا۔ یا شاید، موت نے ان مشہور ہستیوں کو برباد کر کے جموریت پر مہربانی کی، لوگوں کے دلوں سے اُن کے دبدبے کو ختم کر کے، اور اس طرح تعقلی برابری لا کے۔ کیا یہ عزت کی وجہ سے یا شائد بے احترامی کی وجہ سے تھا کہ پچھلے سال موت نے شاہی تاج پہننے والے لوگوں کو نظر انداز کر دیا، Les Dieux sen vontf__ لیکن بادشاہ ابھی تک ہمارے ساتھ ہیں۔

رومانوی مکتب

ہنرخ ہائنے

Schelling سکے لنگ کا رومانوی مکتب پر اثر زیادہ تر اس کی اپنی شخصیت کی وجہ سے تھا، لیکن اس کے علاوہ فطرت کا فلسفہ بھی اس کی ایک وجہ تھا جو اس کے ذریعے مقبولیت اختیار کر گیا، شعرا نے اپنے آپ کو فطرت کے واضح تصورات سے بالا کر لیا ہے۔ ایک گروہ نے اپنے تمام انسانی جذبات کے ساتھ خود کو

فطرت میں مدغم کر دیا، دوسروں کو کچھ جادو کے فارمولے آتے تھے جس کی بدولت اُنہوں نے فطرت سے التجا کر کے کچھ ایسی چیزیں نکلوائیں جو انسانی شکل اور زبان رکھتی تھیں۔ اولذکر مستند صوفی تھے، اور متعدد طریقوں سے ہندوستان کے اُن بھگتوں سے مشابہہ تھے، جو فطرت میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور آخر کار محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ فطرت اور وہ ایک ہیں۔ آخرالذکر کسی حد تک شعبدہ باز تھے جو اپنی مرضی کے مطابق جارح روحوں کو بلا سکتے تھے، وہ عرب کے اُن جادوگروں سے تھے، جو اپنی موج میں، پتھروں کو زندگی دے سکتے تھے، اور زندہ لوگوں کو پتھر بنا سکتے تھے۔ Novalis کا تعلق پہلے طبقے سے تھا، ہوف مین کا بعد والے سے، Novalis ہر شے میں عجوبے دیکھتا تھا، اور وہ دلکش معجزے تھے۔ وہ پودوں کی زبان سمجھتا تھا، وہ ہر جوان اور شگفتہ گلاب کا راز جانتا تھا، آخر کار اُس نے پوری فطرت کو اپنی پہچان بنا لیا، اور جب خزاں آئی تو پتے گرنے لگے تب وہ وہ مر گیا۔ اس کے برعکس ہوف مین کو ہر چیز میں بھوت نظر آتے تھے، وہ اُسے ہر چینی چائے دانی، اور برلن کی ہر چھوٹے بالوں والی وگ کے نیچے سے اشارے کرتے تھے۔ وہ ایسا شعبدہ باز تھا جو انسانوں کو حیوانوں کی تبدیل کر دیتا تھا، اور حیوانوں کو انسانوں میں، یہاں تک کہ پروشیا کے شاہی دربار کے مشیروں میں بھی۔ وہ مردوں کو قبروں میں زندہ کر دیتا تھا، لیکن زندگی نے اس سے منہ موڑ لیا، جیسے کسی ملول بھوت سے۔ اُس نے یہ محسوس کیا، اُسے لگا کہ وہ خود ایک بھوت بن گیا ہے۔ تمام فطرت اُسے نامکمل آئینے جیسی لگی، جس میں اُسے ایک ہزار زاویوں میں اپنا مسخ شدہ چہرہ نظر آیا، اور اُس کا کام بیس جلدوں میں ایک دل خراش خوف کی چیخ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

ہوف مین کا تعلق روحانوی مکتب سے نہیں تھا۔ شلیجل برادارن سے اُس کا رابطہ نہیں ہوا، اور اُن کے رجحانات کا اُس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ میں صرف Novalis کے تضاد میں اُس کا ذکر کرتا ہوں، جو خصوصی طور پر اُس مکتب کا شاعر تھا۔ ہوف مین یہاں Novalis سے کم مشہور ہے جسے Loeve-Veimar نے فرانسیسی پبلک کو بہت عمدہ طریقے سے متعارف کرایا ہے، جس وجہ سے فرانس میں اُس نے بہت شہرت حاصل کر لی۔ جرمنی میں ہوف میں کسی بھی طرح مقبول عام نہیں، لیکن وہ پہلے تھا۔ اُن کے وقت میں اُن کے کام کو بہت پڑھا جاتا تھا، لیکن صرف وہ لوگ پڑھتے تھے جن کے اعصاب یا بہت مضبوط تھے یا بہت کمزور کہ قدرے کم شدید جھٹکا اُن پر اثر انداز نہ ہو سکتی تھیں۔ جو ذہن واقعی تعقلی تھے، اور فطرتیں جو واقعی شاعرانہ تھیں، اُنہیں اُس سے کوئی سروکار نہیں۔ اگرچہ ان جیسوں نے Novalis کو ترجیح دی لیکن کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے، ہوف مین Novalis سے بہت بڑا شاعر تھا، کیوں کہ آخرالذکر اپنی تصوراتی تصویروں کے ساتھ نیلے آسمانوں میں محو پرواز رہتا ہے، لیکن

ہوف مین اپنے مضحکہ خیز بھوت پریت کے باوجود زمینی حقائق کے ساتھ زور سے چمٹا ہوا ہے ___ بالکل جیسے قوی ہیکل Anteus اُس وقت تک طاقت ور اور ناقابل تسخیر رہا جب اُس کے پاؤں دھرتی ماں پر ٹکے ہوئے تھے لیکن جونہی ہرکولیس نے اسے زمین سے اوپر اٹھایا اس کی طاقت جاتی رہی۔ اسی طرح ایک شاعر طاقتور اور زبردست رہتا ہے اگر وہ زمینی حقیقت کو چھوڑ نہ دے۔ لیکن جوں ہی وجد میں آ کر افلاک میں تیرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ بے بس جاتا ہے۔

ان دونوں شاعروں میں گہری مشابہت کی وجہ یہ حقیقت ہے کہ اُن شاعری حقیقتاً ایک مرض تھی۔ یہ کہا گیا ہے کہ اُن کی تحریروں پر رائے دینا نقاد کے بجائے معالج کے دائرہ عمل میں آتا ہے۔ Novalis کی شاعری میں گلابی چمک صحت کی رنگت نہیں بلکہ دِق کی سرخی ہے، اور ہوف مین کے مبالغہ آمیز نظریوں کی چمکتی روشنی جینئس کا نہیں بلکہ بخار کا شعلہ ہے۔

کیا ہمیں اس طرح تنقید کرنے کا حق ہے ___ ہم جنہیں اچھی صحت عطا نہیں کی گئی؟ اور خصوصاً اب، جب تمام ادب ایک بڑے ہسپتال جیسا ہے اور کیا شاعری انسانیت کی بیماری ہے، جیسے موتی بیمار سیپ کے روگی مادہ میں پلا بڑھا۔

Novalis مئی کی دو تاریخ کو سال 1772 میں پیدا ہوا۔ اُس کا اصلی نام ہارڈنبرگ تھا۔ وہ ایک نوجوان حسینہ کی چاہت میں مبتلا تھا جو دق کی مریضہ تھی اور اسی خوفناک مرض کی وجہ سے اُس کی موت واقع ہوئی۔ یہ الم ناک تجربہ اُس کے تمام کام پر اپنی چھاپ چھوڑ گیا۔ اُس کی زندگی ایک خوابیدہ، سست رو موت تھی، اور وہ بھی تپ دق کی وجہ سے 1801 میں فوت ہو گیا، اپنی زندگی کے انتیس برس یا رومان مکمل ہونے سے پہلے۔ یہ رومان اپنی موجودہ شکل میں ایک تمثیل نظر کا صرف ایک حصہ ہے، جس میں ڈانٹے کی Divine Comedy کی طرح، تمام زمینی اور آسمانی معاملات بیان ہونا تھے۔ مشہور شاعر Heinrich von Ofterdingen اس رومان کا ہیرو ہے۔ ہم اس نوجوان کو Eisenach میں دیکھتے ہیں جو ایک چھوٹا مگر خوب صورت گاؤں ہے۔ یہ گاؤں پرانے Wartburg کے دامن میں واقع ہے، اور کچھ بہت اہم اور کچھ نہایت بیہودہ واقعات کا گواہ رہا ہے، کیوں کہ لوتھر نے یہاں اپنی بائبل کا ترجمہ کیا، چند احمق Teuto جنونیوں نے Kamptz کے Gondarnierie-Codex کو جلایا۔ اس حصار میں [لوک] شاعری کا مشہور مقابلہ ہوا، جس میں دوسرے شاعروں کے علاوہ Heinrich Von Ofterdingen کا ہنگری کے Klingsoher کے ساتھ شاعری کا پرخطر مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے کا بیان ہمیں Manessa کے مجموعے میں ملا۔ ہارنے والے شاعر کا سر جلد کے حوالے کر دینا

تھا، اور Thuringia کا Landgraf منصف تھا۔ہم Wartberg کو جو بعد میں علم کا مرکز تھا ہیرو کے ابتدائی ایام پر حاوی دیکھتے ہیں اور ہم Novalis کو رومان کے آغاز میں دیکھتے ہیں کہ وہ پدرانہ چھت کے نیچے ہے'' والدین بستر میں سوئے ہوئے ہیں، دیوار پر پرانا کلاک اکتا دینے والی مسلسل ٹک ٹک جاری رکھے ہے، ہوا چیختی ہے اور کھڑکیاں کھڑکھڑاتی ہیں، اور کمرہ وقفے وقفے سے چاند کی روشنی سے منور ہو جاتا ہے۔

''نوجوان بستر پر بے چینی سے کروٹیں لے رہا ہے، اُس کے ذہن میں اجنبی اور اُس کی کہانیاں آ رہی ہیں۔ یہ خزانے نہیں جنہوں نے میرے اندر ناقابل بیان خواہش جگادی ہے۔اُس نے اپنے آپ سے کہا، لو بھ لالچ میرے آس پاس نہیں، لیکن میرے اندر نیلے پھول کو دیکھنے کی خواہش ہے۔ یہ ہمیشہ میرے خیالوں میں ہے، اور میں کسی اور چیز کے بارے میں نہ سوچ سکتا ہوں اور نہ غور کر سکتا ہوں۔ میری اس طرح کی عجیب وغریب حالت پہلے کبھی نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایسے ہے کہ جیسے اب تک میں خواب دیکھتا رہا ہوں، یا خواب خواب میں کسی اور دنیا میں چلا گیا ہوں، کیوں کہ میں پہلے جس دنیا میں رہتا تھا وہاں پھولوں کی کسے پروا تھی، اور ایک پھول کے لیے اتنا زیادہ جنوں میں نے پہلے کبھی سنا ہی نہیں تھا۔''

یہ Heinrich Von Oftendingen کے ابتدایہ کلمات ہیں، اور تمام رومانس نیلے پھول کی مہک اور چمک سے بھرا ہے۔ یہ حیرت انگیز اور اہم بات ہے کہ اس کتاب کی سب سے اہم شخصیت کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور لگتا ہے کہ پہلے وقتوں میں ہم دوستانہ اور رازدانہ مراسم رکھتے تھے۔ پرانی یادیں زندہ ہو جاتی ہیں، صوفیہ کے نقوش اتنے شناسا ہیں، اور ذہن میں چہل قدمیوں اور نازک لمسوں کی جگہ ساحل سمندر کے درخت آ جاتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اب ماضی میں ہے، کسی نیم فراموش خواب کی طرح۔

Novalis کی شاعری کا سرچشمہ ایک خوبصورت اور نازک سی نوجوان عورت تھی، جس کی آنکھیں نیلی، سنبل نما لٹیں، مسکراتے ہونٹ اور ٹھوڑی کے بائیں جانب چھوٹا سا تل، کیوں کہ میں اُس کی سوچ میں وہی نوجوان عورت دیکھ سکتا ہوں جس کی معرفت میں پہلی دفعہ اُس کے کام سے متعارف ہوا، جب میں نے اُس کی نازک انگلیوں میں، سرخ مراکش چمڑے کی، چمکدار کونوں والی، Heinrich Von Oftendingen کی کتاب دیکھی۔ وہ ہمیشہ نیلا لباس پہنتی اور اُس اُس نام صوفیہ تھا۔وہ Gottingen سے چند سٹیشن دور اپنی بہن پوسٹمسٹرس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ایک خوش باش، متناسب الاعضا، دہکتے ہوئے گالوں والی نوجوان عورت تھی جس کے جسم کے اوپری حصے کے گرد سخت فیتہ ایک قلعے

سے مشابہہ تھا۔ تاہم یہ قلعہنا قابلِ تسخیر تھا۔ یہ اچھی خاتون پاکیزگی کا مجسم تھی۔ وہ ایک محنتی اور باعمل خاتون خانہ تھی، اوراس کے باوجود اُس کا واحد شوق ہوف مین کے رومانس پڑھنا تھا۔ ہوف مین ہی وہ مصنف تھا جواُس کے کھردرے مزاج کو گدگدااور خوشگوار جذبات کو جگا سکتا تھا۔ لیکن اُس کی زرد، نازک سی بہن ہوف مین پر ان کتابوں کو محض دیکھنے ہی سے ناموافقانہ اثر ہوتا تھا۔ وہ اُنہیں چھونے سے گھبراتی تھی۔ وہ ایک حساس پودے جتنی نازک تھی، اوراُس کے الفاظ اتنے معطراور سریلے تھے، کہ اگر سب کو اکٹھا کیا جائے، تونظم بن جائیں۔ میں نے اُس کے چند مقولے لکھے ہیں، اوروہ Novalis کی طرز پر نظمیں ہیں، حرف زیادہ سریلے اورافلاکی۔ اُن میں سے ایک، جواُس نے مجھے اُس وقت سنائی جب میں نے اٹلی جانے سے پہلے اُسے الوادع کہا، میری پسندیدہ نظم ہے۔ خزاں کا موسم ہے، منظر، ایک باغ جہاں چراغاں کیا گیا تھا، اور وہاں ہم جھلملاتے بھونرے، آخری گلاب اورایک جنگلی راج ہنس کے درمیان گفتگو سنتے ہیں۔ صبح کے دندھلکے آتے ہیں، واحد روشنی ٹمٹما کر بجھ جاتی ہے، گلاب کے پتے گر جاتے ہیں، راج ہنس اپنے سفید پر کھولتا ہےاور جنوب کی سمت اُڑ جاتا ہے۔

کیوں کہ Hanover جنگلی راج ہنسوں سے بھراپڑا ہے جوخزاں میں جنوب کی طرف گرمی تلاش کرتے ہیں، اورگرمیوں میں دوبارہ واپس آجاتے ہیں۔ وہ غالباً افریقہ میں سردیوں کا موسم گزارتے ہیں، کیوں کہ ایک دفعہ ایک مرے ہوئے راج ہنس کے سینے میں تیر پیوست ملا تھا، جس کا ماخذ پروفیسر Blumenbrach نے افریقہ بتایا۔ بے چارہ پرندہ اپنے سینے میں تیر لیے مرنے کے لیے اپنے مشرقی گھونسلے میں واپس آیا۔ کئی راج ہنس جن کے سینے میں تیر پیوست ہو، اُن میں شاید اس سفر کی طاقت نہ ہو، اوروہ چلتے ہوئے ریگستانوں میں بےبس ہوکر، یا تھکے ہوئے پروں کے ساتھ کسی مصری احرام پر بیٹھا ہو، اوراشتیاق بھری نظروں سے شمال کی طرف دیکھے، Hanover میں ٹھنڈے گرمئی گھر کی طرف۔

1928 کی سرما کے آخری دنوں میں، جب میں جنوب سے واپس آیا، اپنے سینے میں ایک جلتا ہوا تیر لیے، میرا گزر Gottingen سے ہوا تھا، اور میں اپنی پرانی دوست ___ پوسٹ مسٹرس کے گھر کے پاس رکا، تاکہ گھوڑے تبدیل کرسکوں۔ اُسے ملے ہوئے کافی عرصہ بیت چکا تھا اوراُس خاتون میں ایک غم ناک تبدیلی تھی۔ اُس کے جسم کا اوپر والا حصہ اب بھی ایک قلعہ سے مشابہہ تھا___ لیکن ایک برباد اور منہدم قلعہ۔ برج گر گئے تھے، کوئی سنتری پہرے پر نہیں تھے، اور اُس کا دل، آخری آرام گاہ، ٹوٹ چکا تھا۔ کوچبان Pieper نے بتایا کہ اُس ہوف مین کے ناولوں کا شوق بھی ختم ہوگیا ہے، متبادل کے طور وہ سونے کے وقت کافی مقدار میں برانڈی پیتی ہے۔ آخر الذکر ایک خاصا آسان منصوبہ ہے، کیوں کہ

برانڈی ہمیشہ پاس ہی رکھی ہوتی ہے، جب کہ ناول Deurlich کیگشتی کتاب خانہ Gotter سے ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں، جو کہ ایک گھنٹے کے سفر پر واقع ہے۔ کوچبان Pieper کا جثہ کافی چھوٹا ہے اور یوں لگا جیسے، اُس کے قد کا چھوٹا ہونا سرکہ پینے کی وجہ سے ہوا۔ جب میں اُس پوسٹ مسٹرس کی ہمشیرہ کے متعلق پوچھا تو اُس نے جواب دیا ''وہ جلد ہی مرجائے گی، وہ پہلے ہی ایک فرشتہ ہے۔'' وہ کتنی اچھی رہی ہوگی، کہ اُس جیسے گنوار کے منہ سے بھی یہ الفاظ نکلے ''وہ ایک فرشتہ ہے۔'' یہ بات کرتے ہوئے، وہ اُڑتی اور شور کرتی مرغیوں کو اپنے بڑے بوٹوں سے ٹھوکر مار کر بھگا رہا تھا۔ گھر، کبھی مالکن کی طرح خوش گوار اور روشن تھا، اب خستہ ہوگیا تھا، اپنی مالکن کی طرح، اس کے رنگ میں بیمارانہ زردی تھی، اور دیواروں میں شگافوں کی وجہ سے سلوٹیں پڑ گئیں تھیں۔ صحن میں ٹوٹی ہوئی گاڑیاں پڑی تھیں، اور کوچبان کا سرخ لبادہ ایک کھونٹے پر سوکھنے کے لیے ٹنگا تھا۔ مادام صوفیہ کھڑکی کے پاس کھڑی مصروفِ مطالعہ تھیں، اور جب میں اُن کے نزدیک گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ چمک دار کونوں والی، سرخ مراکشی جلد والی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ یہ Novalis کی Heinrich von Ofterdingen تھی۔ اُس نے یہ کتاب متعدد بار پڑھی، تب تک پڑھی جب تک اُس کے صفحوں نے اُسے دق میں مبتلا کر دیا، اور جب وہ ایک روشن سائے کی طرح لگ رہی تھی۔ اب اُس کی خوبصورتی اتنی افلا کی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے اُس کے دونوں زرد، پتلے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے، اور مسلسل اُس کی آنکھوں میں دیکھا، اور پھر پوچھا ''مادام صوفیہ آپ کیسی ہیں۔'' ''میں ٹھیک ہوں۔'' اُس نے جواب دیا ''اور میں بہتر ہوجاؤں گی۔'' پھر اس نے کھڑکی کے باہر چھوٹے سے ٹیلے پر گرجے کے صحن کی طرف اشارہ کیا۔ یہ اُس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس بنجر ٹیلے پر ایک پتلا، چھوٹا سا، تنہا پوپلر کا درخت کھڑا تھا، جو تقریباً بغیر پتوں کے تھا اور سردیوں کی ہوا میں اِدھر اُدھر جھوم رہا تھا، زندہ درخت کی طرح نہیں بلکہ درخت کے بھوت کی طرح۔

مادام صوفیہ اُس پوپلر کے نیچے دفن ہے، اور چمک دار کونوں والی، سرخ مراکشی چمڑے والی جلد، Novalis کی Heinrich von Ofterdingen، جسے وہ مجھے تحفہ کر گئی تھیں، جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، میرے سامنے رکھی ہے۔ میں نے اس کتاب کو اس باب کی ترتیب میں استعمال کیا ہے۔

ژاں پال رچٹر Jean Paul Richter نے نوجوان جرمنی) کے مکتب کے واضح رجحان کا اندازہ لگالیا۔ تاہم آخرالذکر نے، جو عملی سوالات میں مصروف تھا، تجریدی پیچیدگیوں، یک لخت تکیہ فن،

اورژاں پال رچٹر کے غیر دلچسپ اسلوب سے کنارہ کشی کر لی۔ واضح، منظّم دماغ والا کوئی بھی فرانسیسی اُس مخصوص اسلوب کا نظریہ قائم نہیں کر سکتا۔ ژاں پال رچٹر کا اسلوب چھوٹے چھوٹے خانوں پر مشتمل ایک ڈھانچہ ہے، یہ خانے بعض اوقات اتنے تنگ ہوتے ہیں کہ جب ایک خیال دوسرے سے ٹکراتا ہے، تو اُن کے سر ٹکرا کر ایک دوسرے کو زخمی کرتے ہیں۔ چھت سے کانٹے لٹک رہے ہیں جن پر ژاں پال رچٹر تمام قسم کے خیالات لٹکاتا ہے، اور دیواریں خفیہ درازوں سے بھری ہیں، جن میں وہ جذبات چھپاتا ہے۔ کوئی جرمن مصنف خیالات اور جذبات میں اس جتنا زرخیز نہیں، لیکن وہ اُنہیں پکنے کی اجازت نہیں دیتا، اور، اپنے ذہن اور دل کی دولت کے قطع نظر، وہ لطف سے زیادہ حیرت کو ابھارتا ہے۔ خیالات اور جذبات جو اُگ کر بڑے درخت بنتے ہیں، اگر اُنہیں مناسب طریقے سے جڑ پکڑنے دیا جائے اور اپنی شاخوں، پھولوں، اور پتوں کو پھلنے پھولنے دیا جائے ___ یہ جب جھاڑیاں ہی ہوتی ہیں اور ابھی پھوٹ رہی ہوتی ہیں تو وہ اُنہیں جڑوں سے نکال پھینکتا ہے، اور تعقلی جنگل ہمیں ایک عامیانہ ڈش کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اب، اگرچہ یہ باعث حیرت ہے لیکن یقیناً یہ مردار خوری ہے، کیوں کہ ہر پیٹ چھوٹے بلوطوں، دیوداروں، تاڑ اور کیلے کے درختوں کو ہضم نہیں کر سکتا۔ ژاں پال ایک عظیم شاعرانہ فلسفی ہے لیکن خیالات اور کام کے اسلوب میں اس جتنا غیر فنکارانہ انداز کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اپنے رومانوں میں اس نے چند ایک بڑی شاعرانہ تخلیقات کی ہیں، لیکن اُس کا ہر بچہ ایک لمبے ناڑو کے ساتھ پیدا ہوا ہے جس میں الجھ کر اُن کا دم گھٹ جاتا ہے۔

خیال کے بجائے وہ ہمیں اپنی سوچ کے تانے بانے دیتا ہے۔ ہم اُس کے دماغ کے مادی محمل کو دیکھتے ہیں، جیسا کہ ہے، وہ ہمیں خیال کی بجائے دماغ دیتا ہے، اور اسی اثنا میں اس کے مزاج کے کوندے ادھر اُدھر لہراتے ہیں، اس کے احساس کے پسوؤں کی طرح۔ وہ مصنفوں میں سب سے زیادہ خوش اور ساتھ ہی جذباتی مصور ہے۔ حقیقت میں جذباتی پن ہمیشہ اُس پر غالب آجاتا ہے اور اُس کا قہقہہ اچانک آنسوؤں میں بدل جاتا ہے۔ وہ بعض اوقات ایک غلیظ بھکاری کا بھیس ڈھال لیتا ہے، لیکن پھر سٹیج کے شہزادے کی طرح، اچانک اپنے کھردرے اور کوٹ کے بٹن کھول کر اپنے رتبے کا نشان دکھاتا ہے۔

اس سلسلے میں لارنس سٹرن سے مشابہہ ہے، جس کے ساتھ اکثر اس کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ Tristran Shandy کا مصنف، جب بظاہر ادنیٰ سی بیہودگیوں میں ڈوبا نظر آتا ہے تو پھر بھی اس کے پاس ارفع تک رسائی کا فن ہے اور اس سے وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اُس کا مقام شہزادوں کا ہے اور وہ شیکسپیئر کا ہم وطن ہے۔ لارنس سٹرن کی طرح ژاں پال اپنی تحریروں میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے،

اوراپنی اخلاقی کمزوریوں سے پردہ اُٹھاتا ہے،خصوصاً جنس کے معاملات میں لیکن ایک پھوہڑ شرمیلے پن کے ساتھ۔لارنس سٹرن لوگوں کے سامنے کافی حدتک لباس کے بغیر بلکہ برہنہ نمودونمائش کرتا ہے،لیکن ژاں پال کی پتلون میں صرف چندسوراخ ہیں۔کچھ نقادوں کا غلط خیال ہے کہ ژاں پال کے پاس سٹرنے سے زیادہ سچے احساسات تھے،کیوں کہ اول الذکر المیے کی بلندیوں تک پہنچتا ہے تو آخرالذکر اچانک خوشی اورتمسخر کا لہجہ اختیار کرلیتا ہے۔اس کے برعکس اگر مضمون ہلکے سے بھی سنجیدگی کی طرف مڑے تو ژاں پال آب دیدہ ہوجاتا ہے،اوراطمینان سے اپنے آنسو بہنے دیتا ہے۔لارنس سٹرن میں غالباً ژاں پال سے زیادہ احساس کی گہرائی تھی،کیوں کہ وہ ایک بڑا شاعر ہے۔لارنس سٹرن نے شیکسپیر کی طرح سوچ بچار کر کے نشونما پائی تھی۔عورتوں کے اطوار کے مطابق،اُنہوں نے اپنی لمسوں سے اُس کی جلد کوخراب کردیا۔وہ المیے کی زررد دیوی کا پالتو تھا۔ایک دفعہ اس نے انتہائی نرمی کے دورے میں،اس کا اتنے جذبات سے بوسہ لیا،اتنی شدت کے ساتھ،اپنے ہونٹوں کے اتنے پرجوش دباؤ کے ساتھ،کہ اس کا نوجوان دل آنسو بہانے لگا،اورفوراً دنیاوی دکھ سمجھ گیا اور بے انتہارحم سے بھرگیا۔بے چارہ نوجوان شاعر دل۔لیکن چھوٹی بہن،گل رنگ خوشی کی دیوی،جلدی سے چھلانگ لگا کراُس کے پہلو میں آئی،تکلیف میں مبتلالڑکے کواپنے بازوؤں میں لیا،اورگانے اوررنگ رلیوں سے اُس کا دل بہلایا۔بہلنے کے لیے اُسے مزاح کا نقاب اور ٹنٹناتی گھنٹیاں دیں،اوراس کے ہونٹوں پرسکون بخش بوسہ دیا،اوراس بوسے کے ساتھ اپنی تمام ترنا سمجھی، چنچل خوشی،اپنی غیرسنجیدہ فراست میں بگھودیا۔

اور جب لارنس سٹرن کا دل اور ہونٹ ایک عجیب تضاد کی طرف مڑ گئے۔بعض اوقات جب اس کی روح کسی المیہ جذبے سے بے حد پریشان ہو،اور وہ اپنے لہوروتے دل کے دکھ بھرے جذبات بیان کرناچاہتاہو،تو وہ خود حیران ہوجاتا ہے،جب خوشی بھرے،خوشی بکھیرتے ہوئے الفاظ اُس کے ہونٹوں سے اداہوں گے۔

Baron de la Motte-Fouque، پروشین فوج کا سابقہ میجر تھااور شاعر بھی۔شاعر ہیروؤں میں سب سے نمایاں تھا یا ہیروشاعروں میں سب سے نمایاں تھا۔شاعروں میں،جن کے اشعار اور تلوار نے نام نہاد جنگ آزادی میں شہرت حاصل کی۔

اُس کی شہرت مستند ہے۔وہ ایک سچا شاعر ہے،اور شاعری کی تحریک اُس کی پیشانی پر ہے۔ ہمارے Fouque جتنا عالمی خراج عقیدت کم شاعروں کو ملا ہے۔اب اس کے قاری صرف گشتی کتب

خانوں کے سرپرست ہیں۔لیکن قاریوں کی تعداد اب بھی کافی ہے اور Fouque دعویٰ کرسکتا ہے کہ رومانوی مکتب میں سے وہ واحد تھا جسے نچلے طبقے نے بھی خوش آمدید کہا۔ برلن جمالیاتی چائے کی محفلوں میں اُس وقت یہ دستور بن گیا تھا کہ شکست خوردہ سورماؤں کا مذاق اُڑایا جائے۔Hartz نامی چھوٹے سے گاؤں میں میری ایک بہت ہی خوبصورت خاتون سے شناسائی ہوئی، اور اُس نے شرماتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ خوشی سے اپنی زندگی کا ایک سال دے گی اگر اُسے ''Undine'' کے مصنف کے ہونٹوں کو چومنے کا ایک موقع مل جائے ___ اور اُس خاتون کے ہونٹوں سے زیادہ خوب صورت میں نے نہیں دیکھے تھے۔

Undine واقعی ایک دل موہ لینے والی نظم ہے۔ یہ نظم بذات خود ایک بوسہ ہے۔شاعری کے جینئس نے سوئی ہوئی بہار کو چوما، اور جیسے ہی اس نے اپنی ہنستی ہوئی آنکھیں کھولیں تمام گلابوں نے اپنی میٹھی خوشبو اُڑادی، اور تمام بلبلوں نے گایا، اور پھولوں کی مہک اور بلبلوں کے گانے، ان سب کو ہمارے اچھے Fouque نے الفاظ کا جامہ پہنایا اور اسے Undine کا نام دیا۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس ناول کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا ہے کہ نہیں۔ یہ ایک جل پری کی کہانی ہے جس کی روح نہیں، اور جسے روح ایک زمینی نواب کے عشق میں مبتلا ہونے کے بعد ملتی ہے۔اُس کا نوابی ساتھی بے وفا ہوجاتا ہے، اور وہ اُسے بوسے سے مار دیتی ہے۔ کیوں کہ اس کتاب میں موت صرف ایک بوسہ ہے۔

اس Undine کی شاعری کی سوچ سمجھا جاسکتا ہے۔اگرچہ وہ بیان سے بھی زیادہ خوب صورت ہے، اگرچہ وہ ہماری طرح ہی دکھ اُٹھاتی ہے، اور زمینی دکھ اُس پر بہت بھاری ہیں، پھر بھی وہ اصل انسان نہیں۔لیکن ہمارا دور پریوں کی تصویروں سے منہ موڑ چکا ہے، وہ چاہے جتنی بھی خوبصورت ہوں۔شاعری اصل زندگی کے خطوط کی متقاضی ہے۔ ادب سب سے کم جل پریوں کو برداشت کرے گا جنہیں اعلیٰ نوابوں سے محبت ہوجائے۔ یہ رجعت پسندانہ رجحان، یہ مسلسل نوابی کی تعریف، یہ فیوڈل نظام کا لگاتار چرچہ، مہم جوئی کی پرشور بکواس، آخر کار تعلیم یافتہ جرمن درمیانے طبقے کے لیے یہ مزہ ہوگیا، اور اُنہوں نے اُس گائیک سے منہ موڑ لیا جو بے وقت کی راگنی الاپتا تھا۔ درحقیقت ذرہ بکتر کی اکتا دینے والی آوازیں، جنگی گھوڑے، اعلیٰ نسل کی خواتین، ایمان دار تاجران، بونے، نواب، قلعے، گرجے، مغنی شاعر، ایمان، اور اس کے علاوہ قرون وسطیٰ کی فضولیات کو جو بھی نام دیا جائے، ہمیں اکتا دیتی ہیں۔کم تر طبقے اور ساتھ ہی خواص کا ذہین شاعر Baron de la Motte-Fouque جیسے جیسے اپنی بہادری کی کتابوں اور

ماضی کی یادداشتوں میں گم ہوتا گیا، وہ حال سے بے بحرہ ہوتا گیا، اور پھر اُس کے بہترین دوست بھی تذبذب میں سر ہلاتے اس سے دور ہو گئے۔

اُس کی بعد کی تحریریں غیر دلچسپ ہیں۔ پہلی تحریروں کی خامیاں مزید وضاحت کے ساتھ دہرائی گئی ہیں۔ اس کے سورمافولا داور جذباتیت کا آمزش ہیں، نہ اُن کا حقیقی وجود ہے اور نہ ہی ان میں معمولی سی عقل۔ اس کی ہیروئین عورتوں سے سرسری طور پر مشابہہ ہیں، وہ گڑیوں کی طرح ہیں جن کی نازک لٹیں چہروں پر لٹک رہی ہیں جو پھولوں کی طرح خوب صورت اور بے تاثر ہیں۔ والٹر سکاٹ کے کام کی طرح ہمیں Baron de la Motte-Fouque کے بہادری کے رومان اُن عجیب وغریب گل کاریوں، جنہیں گوبلن کہتے ہیں، کی یاد دلاتے ہیں، جن کی عمدہ بناوٹ اور گہرے رنگ روح کی اخلاقی اصلاح کرنے کے بجائے آنکھوں کو بھاتے ہیں۔ ہم سورمائی شان وشوکت، چرواہوں کی تہواری کھیلیں، دست بدست لڑائیاں اور پرانی رسوم، ایک دوسرے میں رچی بسی دیکھتے ہیں۔ یہ سب خوبصورت، دل کش لیکن چمک دار سطحیت ہے۔ والٹر سکاٹ کے نقالوں کی طرح Fougue کے نقالوں نے، اظہار کا اسلوب ___ انسانوں اور اشیا کی داخلی فطرت نہیں، بلکہ خارجی حلیہ اور لبادہ ___ اور بھی انتہا تک پنچایا۔ یہ سطحی فن اور بے وقت اسلوب جرمنی کے علاوہ انگلستان اور فرانس میں اب بھی رائج ہے۔ اگر چہ بیان بہادری کے دور کو مزید نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ اُس کا رخ ہمارے جدید دور کی طرف ہے، یہ اب بھی وہی اسلوب ہے، جو مظاہر کے ضروری نقطوں کے بجائے صرف سطحی اور حادثاتی نقطوں کو گرفت میں لیتا ہے۔ انسانیت کے علم کے بجائے موجودہ ناول نویس لباسوں سے کے بارے میں اپنے علم کا واضح اظہار کرتے ہیں، وہ شاید اپنے آپ کو پرانی کہاوت سے صحیح ثابت کرتے ہیں، ''درزی آدمی کو بناتا ہے۔'' یہ پرانے خصوصاً انگریزی ناول نویسوں سے کتنا مختلف ہے۔ رچرڈسن ہمیں جذبات کی ساخت بتاتا ہے۔ گول سمتھ اپنے پیروؤں کے میلانِ طبع کو تجرباتی طور پر دیکھتا ہے۔ Tristram Shandy کا مصنف ہم پر انسانی روح کی واضح گہرائیاں افشاں کرتا ہے، جیسا کہ ہے، وہ روح کی دراڑ کھولتا ہے، ہمیں اس کے پاتال میں ایک نظر ڈالنے کی اجازت دیتا ہے، اس کی جنت اور گندے ترین حصوں میں، پھر وہ ایک دم اس پر پردہ گرا دیتا ہے۔ ہم نے اُس حیرت انگیز تھیٹر کا سامنے سے نظارہ کیا ہے ،یعنی روح کا۔ روشنیاں اور تناظر اپنے اثر میں ناکام نہیں ہوئے، اور جب ہم نے تصور کیا کہ ہم لامتناہی کو دیکھ رہے ہیں، ہمارے دل لامتناہیت اور شاعری سے لبریز ہو چکے ہیں۔ فیلڈنگ ایک دم ہمیں نظاروں کے پیچھے لے جاتا ہے، اور وہاں تمام جذبات ہمیں مکارانہ بدمعاشی سے ڈھکے نظر آتے ہیں،

ذلیل ارادے جو فیاضی وسخاوت کا پردہ اوڑھے ہیں، سیاہ رال جس نے بلندی میں روشن ہوکر ولولہ بن جاتا ہے، ڈھول جس پر چھڑیاں آرام سے رکھی ہوں، جن کے مقدر میں جذبے کی خوفناک رعد کی گرج ہیں۔ مختصراً ہمیں وہ تمام نظام دکھاتا ہے جس سے تھیٹرائی اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اس بے انتہا مکاری کو دکھاتا ہے جس سے لوگ حقیقت سے بالکل مختلف روپ اپناتے ہیں، اور جس کے ذریعے زندگی کی خوشی اور سچائی گم جاتی ہیں۔ لیکن انگریزوں کی مثال دینے کی کیا ضرورت ہے جب کہ ہمارے گوئٹے نے ولہلم ماسٹر کی شکل میں ہمیں ناول کا بہترین ماڈل دیا ہے؟

Fouque کے ناولوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ کثرت نگار مصنفین میں سے ایک ہے۔ The Magic Ring اور Thiodolph The Icelander ایک موافق تذکرے کے مستحق ہیں۔ اس کے بحروائے ڈرامے، جو سٹیج کے لیے نہیں لکھے گئے تھے، بہت خوبصورتیوں کے حامل ہیں۔ Sigurd The serpent slayer ایک بے باک کتاب ہے جس میں پرانی سکینڈے نیووین اساطیر تمام تر عظمت اور جادوئی خصوصیات کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ Sigurd، ڈرامے کا اہم کردار ایک بڑی تخلیق ہے۔ وہ اتنا مضبوط ہے جتنا کہ ناروے کی پتھریلی گھاٹیاں، اور اتنا خوف ناک جتنا سمندر جوان کی بنیادوں سے ٹکراتا ہے۔ وہ اتنا دلیر ہے جتنے سو شیر اور اتنا عقل مند جتنے دو گدھے۔

Herr Ludwig Uhland ایک سچا غنایہ شاعر ہے۔ وہ 1787 میں Tubingen میں پیدا ہوا، اور اب Stuttgard میں وکیل ہے۔ مصنف نے شاعری کی دو جلدیں، دوالیے، Walther Von Der Vogelweide پر دو مقالے اور پرانی فرانسیسی شاعر پر لکھا ہے۔ آخرالذکر دو چھوٹی تحقیقی تحریریں ہیں، اور قرون وسطیٰ کی شاعری کے وسیع مطالعے کی گواہی دیتی ہیں۔ Duke Ernest of Suabia المیوں کے عنوان ہیں۔ میں نہ تو اولذکر کو پڑھا ہے اور نہ ہی اسے دونوں میں بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اور آخرالذکر بے شمار خوب صورتیوں کا حامل ہے، اور اپنے اعلیٰ اور بلند جذبات سے دل کو بھاتا ہے۔ یہ شاعری کی میٹھی خوشبو سے معطر ہے، جیسا کہ ہم اُن قطعوں میں دیکھتے ہیں جو آج کل سٹیج پر بے انتہا داد وصول کرتے ہیں۔ جرمن وفاداری ڈرامے کا موضوع ہے، اور اسے ہم ایک مضبوط شاہ بلوط کی طرح طوفانوں کا مقابلہ کرتے دیکھتے ہیں۔ جرمن محبت، جو بمشکل دیکھی جاسکتی ہے، دور دراز علاقوں میں پہنچتی ہے، لیکن اس کی بنفشی خوشبو ہمارے دلوں کو چھو کر اداکرتی ہے۔ اس ڈرامے، بلکہ اس نظم میں ایسے ٹکڑے ہیں جو ہمارے ادب کے بیش قیمت جواہر ہیں، قطع نظر اس کے کہ تھیٹر جانے والے لوگوں نے اس ٹکڑے کو پسند کیا یا لاتعلقی سے رد کر دیا۔ میں تھیٹر دیکھنے والے اچھے لوگوں سے زیادہ ناراضگی کا اظہار

نہیں کروں گا۔ان لوگوں کی کچھ ضرویات ہیں جنہیں وہ چاہتے ہیں کہ شاعر پورا کرے۔پیش کش صرف شاعر کے دل کی ہمدردیوں کو ہی بیان نہ کرے، بلکہ وہ اپنے تماش بینوں کی خواہش کو بھی مقدم رکھے۔ آخرالذکر ریگستان میں بھوکے بدو کیطرح ہیں، جوسوچتا ہے کہ اُسے مٹروں کی بوری مل گئی ہے، لیکن، افسوس! وہ صرف ہیرے ہیں۔

بیس برس پہلے میں ایک لڑکا تھا، اوراس وقت میں Uhland پر کناروں سے چھلکتا کتنا شوق لٹاتا! اس وقت میں اس کے خصائص کو اب سے بہتر سمجھ سکتا تھا، اُس وقت ہم خیالات اوراحساسات کے اسلوب میں ایک جیسے تھے۔لیکن اُس وقت سے اب تک اتنا کچھ ہو چکا ہے! جو مجھے اُس وقت اتنا عظیم لگتا تھا: تمام بہادری اور کیتھولزم، وہ تمام گھڑسوار جوسورمائی مقابلوں میں ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں، وہ سورماؤں کے شریف شاگرداور اعلیٰ نسل کی پاکیزہ خواتین،Norseland کے ہیرواور گویے، پادری اور راہبائیں، آبائی قبریں جن میں پیش گوئی کرنے کی ولولہ انگیز صلاحیت تھی، بے رنگ جذبات جن کو تارک الدنیا ہونے کے دعووں سے اعلیٰ تر بنانے کی کوشش کی جاتی تھی، اور جنہیں گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ سریلی ترتیب میں بیان کیا جاتا تھا، بیچارگی کے مسلسل نوحے ___ میرے لیے یہ سب کتنا بدمزہ ہوگیا ہے۔لیکن ایک وقت میں یہ سب کتنا مختلف تھا۔کتنی دفعہ دریائے Rhine کے کنارے Dasseldorf کے پرانے قلعے کے کھنڈرات میں بیٹھ کر Uhland کی سب سے خوب صورت نظم کو بلند آواز میں پڑھتا رہا ہوں۔

ایک آوارہ چرواہ، نوجوان اور خوبصورت،
بھٹک کے پہنچا شاہی قلعے کے نیچے،
اور شہزادی نے جب دیکھا اُسے وہاں،
شوقِ محبت سے حسینہ تڑپ اُٹھی،

اور پھر محبت بھرے لہجے میں، وہ بولی
آہ! ممکن ہے میں آؤں تمہارے پاس
وہ میمنا ہے کتنا سفید، کتنے سرخ
مرغزار میں پھول۔''

نوجوان نے نیچے سے دیا جواب
''تم اگر میرے پاس آؤ، نیچے!
کتنی چمک ہے تمہارے گلابی گالوں میں
کتنے سفید میں وہ بازو دیکھتا ہوں۔''

خاموش درد لیے، ہر صبح
قلعے کے پاس سے لے جاتا وہ ریوڑ اپنا
اور اوپر دیکھتا، تاوقتیکہ دوبارہ
محبت اس کی بلندی پہ آتی

''آہ خوش آمدید! خوش آمدید! شہزادی پیاری!''
خوشی بھری اُس کی آواز گونجی، بلند اور واضح
نرمی سے پھر اس نے تعمیمات کہا
''عنایت ہے، میرے پیارے چرواہے۔''

ٹھٹھرتی سردی گئی، بہار پلٹ آئی پھر
ہر طرف پھول کھلے
چرواہے نے ڈھونڈا اپنی محبوبہ کو_ بے سود
پھر وہ دوبارہ نہ آئی

''آہ! خوش آمدید! خوش آمدید! شہزادی پیاری''
دکھ میں ڈوبے الفاظ تھے اُس کے، اور تھکے ہوئے۔
ایک روح کی آواز گونجی ہواؤں میں
''الوداع! میرے چرواہے پیارے۔''

اور جیسے میں قلعے کے کھنڈرات میں بیٹھا نظم پڑھتا، بعض اوقات Rhine کی لہروں کو تمسخر اُڑاتے سنتا، او رطربیہ گداز کے ساتھ ٹیپ کا مصرعہ پرھتا ہوں، اور نیچے بہتے دریا کی آہوں اور سسکیوں میں، میں دبے لہجوں میں سن سکتا ہوں!

ایک روح کی آواز گونجی ہواؤں میں

''الوداع! میرے چرواہے پیارے

لیکن میں جل پریوں کی چہلوں کو دخل اندازی نہیں کرنے دوں گا، اگرچہ وہ Uhland کی نظموں کے چند خوب صورت ٹکڑوں پر طنزاً دبی دبی ہنسی ہستی ہیں، خصوصاً جب شفق اندھیرے میں ڈھلنا شروع ہوگئی، اور اُس خوف کو دور کرنے کے لیے جس کو پرانے قلعے نے تحریک دی تھی، میں اپنی آواز اونچی کر لیتا، کیوں کہ ایک روایت کے مطابق کھنڈرات میں ایک بغیر سر کے عورت کا بسیرا ہے۔ بعض اوقات میں اس کے ریشمی چوغے کی سرسراہٹ سنتا، اور میرا دل تیزی سے دھڑکتا، وہ دور تھا، اور وہ جگہ تھی، جہاں Ludwig Uhland کی نظموں سے سرشار ہوسکتا تھا۔

وہی جلد میرے ہاتھ میں ہے، اُس وقت سے بیس برس گزر چکے ہیں، میں بہت کچھ دیکھ چکا ہوں اور سیکھ چکا ہوں، میں بغیر سر کے انسانوں میں اب یقین نہیں رکھتا، اور پرانی بھوت کہانی میں مجھ پر اثر انداز ہونے کی طاقت نہیں۔ جس گھر میں بیٹھتا اور پڑھتا ہوں Boulevard Montmartre پر واقع ہے، اس جگہ کے اردگرد دن کا شدید ہنگامہ اضطراب کی لہروں میں تبدیل ہوتا ہے، اور جدید رزمیے کی اونچی اور تیکھی آوازیں سنی جاتی ہیں۔ پہلے، قہقہوں کی کھڑک، پھر ایک مستقل بھاری آواز، اس کے بعد، تیز لے میں بجتے ہوئے ڈھول، اور پھر، ایک کوندے کی طرح، نیشنل گارڈ تیز چلتے ہوئے گزرتے ہیں، اور ہر کوئی فرانسیسی بولتا ہے۔ اور کیا یہ جگہ Uhland کی نظمیں پڑھنے کے لیے مناسب ہے؟ تین مرتبہ میں نے اُسی نظم کی اختتامیہ سطور دوبارہ پڑھی ہیں، لیکن اب وہ کاٹ دار، ناقابل بیان درد محسوس نہیں کرتا جس نے مجھے نوجوان شہزادی کے مرنے پر اکسایا تھا، اور خوب صورت چرواہا لڑکا اتنے درد سے بلاتا ہے،: خوش آمدید! خوش آمدید! شہزادی پیاری!

''ایک روح کی آواز گونجی ہواؤں میں

الوداع! میرے چرواہے پیارے۔''

شاید اس طرز کی نظموں میں میرے شوق کی کمی جزوی طور پر میرے اُس تجربے سے اُبھرتی ہے کہ سب سے تکلیف دہ محبت وہ نہیں جو چاہت کے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو، یا اُسے موت کے

ہاتھوں کھو بیٹھے۔ درحقیقت، یہ زیادہ تکلیف دہ ہے کہ اپنی محبت کو بازوؤں میں تھام کر، اُسے اپنی ضد اور احمقانہ شکوک سے ہمیں پریشان کرنے دیں، تاوقتیکہ دن اور رات ناقابل برداشت بنا دیے جائیں، اور جو ہمیں بہت پیاری ہے اُس کے لیے دل کے دروازے بند کر کے، اُس طاعون سی پیاری عورت کو ڈاک کی گاڑی میں چلتا کریں!

الوداع، آہ! شہزادی پیاری!

یقیناً، زندگی کے ذریعے نقصان موت کے ذریعے نقصان سے زیادہ تکلیف دہ ہے، مثال کے طور پر، جب محبوت ناز و ادا سے منہ موڑے، جب وہ نقاب پوش رقص پر جانا چاہتے، جہاں کوئی بھی باعزت شخص ساتھ لے کر جانے کی جرات نہ کرے، اور وہاں پہنچ کر، پہلے نظر آنے والے اوباش کا بازو تھام لے، اور آپ کو تنہا چھوڑ دے۔

الوداع، میرے چرواہے پیارے

شاید Hess Uhland بذات خود ہم سے بہتر نہیں رہا۔ شاید اُس وقت سے اُس کا مزاج تبدیل ہو گیا ہے۔ چند مستثنیات کے سوا، اس نے بیس برسوں میں کوئی نظم تخلیق نہیں کی۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس شاعر روح کو فطرت نے اتنی تنگ دستی سے شاعرانہ تخلیق عطا کی تھی، اور اُسے ایک ہی بہار ملی۔ نہیں، میں Uhland کی خاموشی کو اس کی سوچ اور سیاسی مقام کے درمیان تضاد کی وجہ مانتا ہوں۔ المیہ شاعر، جس کی بیلڈ (Ballads) اور رومانوں میں ماضی کے کیتھولک۔ جاگیردارنہ ماضی کی تعریف اتنی خوب صورتی سے گائی گئی ہے، قرون وسطیٰ کا Ossian تب سے Wartemburg کے قابل ذکر لوگوں کی جماعت کا رکن بن گیا ہے، عوامی حقوق کا پر جوش حامی، اور تمام شہریوں کی برابری کا پیروکار۔ Hess Uhland نے اس سلسلے میں بھاری ذاتی قربانیاں دے کر اپنے جمہوری اور پروٹسٹنٹ عقائد کے مکمل اخلاص کو ثابت کیا ہے۔ شروع کے دنوں میں اُس نے کسی حد تک شاعرانہ کامیابی حاصل کی، اور اب مدنی پاکیزگی کی تعریف بھی حاصل کر لی ہے۔ لیکن صرف اس لیے کہ جدید رزمیہ کے ساتھ ہمدردی میں وہ اتنا ایمان دار تھا کہ وہ پرانے وقتوں کے گانے اُسی شوق اور شدت کے ساتھ نہیں گا سکتا تھا۔ اس کا پیگاسس (اساطیری گھوڑا) ایک نوابی گھوڑا تھا جو خوش سے ماضی کی طرف دلکی چلتے گیا، لیکن جب اُسے جدید زمانے میں جانے کو مجبور کیا گیا تو اس نے ڈھٹائی سے جواب دے دیا، چناں چہ ہمارا قابل احترام 'Uhland مسکراتے ہوئے گھوڑے سے اُترا، خاموشی کے ساتھ سرکش گھوڑے سے زین اُتاری، اور اسے واپس اصطبل لے گیا۔ اور یہ آج تک وہاں ہے، اپنے ساتھیوں کی

طرح، مشہور جنگی گھوڑا Bayard (ایک جادوئی گھوڑا)، اُس کے پاس تمام ممکنہ خوائص ہیں اور صرف ایک خامی، یہ مر چکا ہے۔

یہ مجھ سے تیز نظر رکھنے والوں سے نہ بچ سکتا تھا، کہ پر وقار جنگی گھوڑا، چمکتی ڈھال اور غرور سے جھومتے پھندنوں سے آراستہ، اپنے اس بورژوا سوار کے لیے کبھی مناسب نہیں تھا، جس نے یوٹون اور سنہری کیل والی ایڑی کے بجائے، جوتے اور ریشمی موزے پہنے تھے، اور جس نے خود کے بجائے Tubingen پروفیسر کی ٹوپی (Hat) پہنی تھی۔ بعض لوگ یہ دریافت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ Uhland کو اپنے موضوع سے مکمل طور پر ہمدردی نہیں تھی، اس کی تحریروں میں قرون وسطیٰ کی ناتجربہ کاری، گستاخی، لب و لہجے کی مثالی وفاداری کے ساتھ تخلیق مکرر نہیں کی گئی، بلکہ اُنہیں ایک بیمار، جذباتی اداسی میں تحلیل کر دیا گیا ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ Uhland نے اپنے مزاج میں سورمائی حکایتوں اور لوک گانوں کے مضبوط اور کھردورے اثرات قبول کر لیے تھے، تاکہ اُنہیں جدید عوام کے لیے قابل قبول بنا سکے۔ دراصل جب ہم Uhland کی عورتوں کو باریکی سے دیکھتے ہیں تو صورت سائے، تجسیم ہوئی چاندنی، اُن کی رگوں میں دودھ دوڑتا، آنکھوں میں میٹھے آنسو یعنی وہ آنسو جن میں نمک نہیں، جیسی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ اگر ہم Uhland کے نوابوں کا پرانے بیلڈ (ballads) کے نوابوں سے موازنہ کریں تو محسوس ہوگا کہ اگر اولذکر سیسے کے بکتر کے بنے ہوئے تھے، جو مکمل طور پر گوشت اور ہڈیوں کے بجائے پھولوں سے بھرے تھے۔ چناں چہ Uhland کے نواب پرانے نڈر لوگوں کے مقابلے میں ننھوں کو زیادہ فرصت بخش محسوس ہوتے ہیں، جو لوہے کی بھاری پتلون پہنے تھے، بہت خوش خوراک تھے اور اس سے بھی زیادہ، پینے والے۔

لیکن Uhland میں خامیاں ڈھونڈنے کی یہ وجہ نہیں۔ وہ جرمنی کے ماضی کی ٹھیک ٹھیک نقل پیش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غالباً وہ ہمیں روحانی انعکاس سے خوش کرنا چاہتا تھا، اور اس طرح اُس نے اپنے جینیئس کے جھٹ پٹے کی روشنی سے ایک خوشامدانہ تصویر پیش کی۔ یہ اُس کی نظموں کو ایک خصوصی سحر عطا کرتا ہے، اور ان کے لیے متعدد شریف اور اہل لوگوں کی صحبت اور تعریف حاصل کرتی ہیں۔ کمزور ترین عکس کے باوجود، ماضی اپنے جادو کی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جن آدمیوں نے شوق سے جدیدیت کی وجوہات کو اپنایا، وہ ہمیشہ پرانے وقتوں کے اثاثوں کے لیے دردمندی رکھتے ہیں۔ ماضی کے آسیب کی آوازیں، اُن کی بازگشت جتنی بھی کمزور ہو، حیران کن طریقے سے ہماری روحوں کے ہلاتی ہیں۔ چناں چہ یہ فوراً قبول کر لینا چاہیے کہ قابل احترام Uhland کے بیلڈ (ballads) اور رومانسوں نے

نہ صرف 1831 کے محبّ وطنوں اور پاکیزہ نوجوانوں اور جذباتی نوجوان عورتوں سے پرتپاک تعریف حاصل کی، بلکہ زیادہ طاقت وراور زیادہ جدید ذہنوں سے بھی۔